سہ ماہی
علمی و تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

26

ادار یہ

حروف مقطعات () مختلف آرا تجزیاتی مطالعہ

پیغمبر اکرمﷺ کی رحمت اور شدت کے نمونے

واقعہ کربلا اور کوفیوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات

اصحاب حسینی کا جذبہ وفاداری

گفتنی ہا

بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کا تاریخی جائزہ

اہل قبلہ کی حرمت تکفیر کتاب وسنت کی نظر میں

احکام اسلامی کا فلسفہ

آئمہ اطہار کا مختلف زبانوں سے آشنا ہونا

نَمُت

(نورالہدیٰ مرکز تحقیقات)

دھوکہ باز دنیا سے آگاہی

وَأُحَذِّرُكُمُ الدُّنْيَا فَإِنَّهَا مَنْزِلُ قُلْعَةٍ، وَلَيْسَتْ بِدَارِ نُجْعَةٍ، قَدْ تَزَيَّنَتْ بِغُرُورِهَا، وَغَرَّتْ بِزِينَتِهَا۔ دَارُهَا هَانَتْ عَلَى رَبِّهَا، فَخَلَطَ حَلَالَهَا بِحَرَامِهَا، وَ خَيْرُهَا بِشَرِّهَا، وَحَيَاتُهَا بِمَوْتِهَا، وَ حُلْوُهَا بِمُرِّهَا۔ لَمْ يُصْفِهَا اللهُ تَعَالَى لِأَوْلِيَائِهِ، وَ لَمْ يَضِنَّ بِهَا عَلَى أَعْدَائِهِ۔ خَيْرُهَا زَهِيدٌ، وَ شَرُّهَا عَتِيدٌ، وَ جَمْعُهَا يَنْفَدُ، وَ مُلْكُهَا يُسْلَبُ، وَ عَامِرُهَا يَخْرَبُ۔ فَمَا خَيْرُ دَارٍ تُنْقَضُ نَقْضَ الْبِنَاءِ وَعُمُرٍ يَفْنَى فَنَاءَ الزَّادِ وَ مُدَّةٍ تَنْقَطِعُ انْقِطَاعَ السَّيْرِ!

یعنی: ''میں تمہیں اس دنیا سے ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ کوچ کی جگہ ہے، آب ودانہ کی منزل نہیں ہے۔ یہ اپنے دھوکہ دہی سے آراستہ ہو گئی ہے اور اپنی آرائش ہی سے دھوکہ دیتی ہے۔ اس کا گھر پروردگار کی نگاہ میں بالکل بے ارزش ہے، اسی لئے اس نے اس کے حلال کے ساتھ حرام، خیر کے ساتھ شر، زندگی کے ساتھ موت اور شیرین کے ساتھ تلخ کو رکھ دیا ہے اور نہ اس نے اسے اپنے اولیاء کے لئے مخصوص کیا ہے اور نہ اپنے دشمنوں کو اس سے محروم رکھا ہے۔ اس کا خیر بہت کم ہے اور اس کا شر ہر وقت حاضر ہے۔ اس کا جمع کیا ہوا ختم ہو جانے والا ہے اور اس کا ملک چھن جانے والا ہے اور اس کے آباد کو ایک دن خراب ہو جانا ہے۔ بھلا اس گھر میں کیا خوبی ہے جو کمزور عمارت کی طرح گر جائے اور اس عمر میں کیا بھلائی ہے جو زادراہ کی طرح ختم ہو جائے اور اس زندگی میں کیا حسن ہے جو چلتے پھرتے تمام ہو جائے؟!'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۳)

بسم الله الرحمن الرحيم

اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ جریدہ یونی ورسٹیوں اور دینی مدارس کے اساتذہ اور طلاب کا اپنا جریدہ ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا اور ان کے زور قلم کو مزید نکھارنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون اور ان کے قیمتی مشوروں کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم وتدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شایع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گرانقدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیرِ نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس/پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ دے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لیے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں اس ترتیب سے لکھے جائیں:
  کتاب کا نام؛ مصنف کا نام؛ پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔
- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- مجلّہ، مقالات کی ادبی، فنّی اور ظاہری آرائش اور عبارتوں کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

جلد: ۵
ذوالقعدۃ
تا
محرم
۱۴۳۶ھ
بمطابق
اکتوبر تا دسمبر
2014
شمارہ: ۴

سہ ماہی

علمی و تحقیقی

نور معرفت

Declaration No: 7334

ISSN 2221-1659

مدیر اعلی
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
- ڈاکٹر ساجد علی سجانی
- ڈاکٹر سید راشد عباس
- ڈاکٹر کرم حسین وڈھو
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
- ڈاکٹر سید ناصر زیدی
- سید ثمر علی نقوی
- سید علی مرتضی زیدی

کمپوزنگ/ڈیزائننگ بابر عباس

پرنٹر: پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شمارہ **130** روپے
زرسالانہ **500** روپے

زرسالانہ **150** ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرسالانہ **070** ڈالر مڈل ایسٹ

"**نمت**" (نورالہدیٰ مرکز تحقیقات)
نورالہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) سادات کالونی بارہ کہو، اسلام آباد
051-2231937 www.nmt.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

نوٹ: ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۷
۲	گفتنی ہا	مدیر	۹
۳	حروف مقطعات (۲) مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ	ثاقب اکبر	۱۹
۴	پیغمبر اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے نمونے قرآنِ کریم کی روشنی میں	سید عقیل حیدر زیدی	۳۷
۵	واقعہ کربلا اور کوفیوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات	سید رمیز الحسن موسوی	۶۷
۶	اصحاب حسینی کا جذبہ وفاداری	ڈاکٹر عباس حیدر زیدی	۸۹
۷	عہد جاہلیت سے عہد رسالت تک بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کی رقابت کا تاریخی جائزہ	ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی	۱۰۷
۸	اہل قبلہ کی حرمتِ تکفیر کتاب و سنت کی نظر میں	سید مزمل حسین نقوی	۱۲۵
۹	احکام اسلامی کا فلسفہ نہج البلاغہ کی روشنی میں ایک مطالعہ	روشن علی	۱۴۳
۱۰	آئمہ اطہارؑ کی مختلف زبانوں سے آشنائی	سید حسنین عباس گردیزی	۱۶۵
۱۱	ایک آسمانی شہر کی سیاحت	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۱۷۹

کچھ "نَمُت" کے بارے میں

" نَمت" (NMT) "نور الہدیٰ مرکز تحقیقات "کا مخفّف اور "نور الہدیٰ ٹرسٹ "کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا نصب العین، اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم اور بالخصوص ملت تشیّع کو فکری پسماندگی سے نجات دلا کر اسلامی تہذیب کی تشکیلِ نو کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ نور الہدیٰ ٹرسٹ کی نظر میں اسلامی تہذیب کی حیاتِ نو واحد راستہ، اسلام کی حقیقی تعلیمات کو ضروری تحقیق اور جانچ پڑتال کے بعد افراد ملت کے سامنے رکھنا ہے۔ ٹرسٹ ہذا نے اپنی استطاعت کے مطابق پاکستان کی مخلص مسلمان امت کی اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش میں تحقیقات کی بنجر سرزمین پر "نَمت" کا پودا اِس یقین کے ساتھ کاشت کیا ہے کہ :

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ! "

اگرچہ " نَمت" (NMT) "نور الہدیٰ مرکزِ تحقیقات "کا مخفّف ہے؛ لیکن یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ عربی لغت میں "نَمُت" ایک ایسی جڑی بوٹی کا نام بھی ہے جس کا پھل کھایا جاتا ہے۔(1) یقیناً "نَمت" وہی "نَمُت" ہے جسے نور الہدیٰ ٹرسٹ نے دیارِ علم و تحقیق کی بنجر سرزمین پر کاشت کیا ہے۔ لیکن اس امید پر کہ یہ سرزمین ایک دن ضرور آباد ہو گی اور یہاں کئی نہال کاشت کیے جائیں گے جن کے پروان چڑھنے سے اِس دھرتی پر تحقیقات کا چمن آباد ہو گا (ان شاء اللہ)۔

بہر صورت، دینی بصیرت وآگہی کو فروغ دینے والی کتب کی تالیف، ترجمہ اور اشاعت "نَمت" کا مشن ہے۔ یہاں اِس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ جہاں تحقیق پر ہمارا اصرار ہے، وہاں ہماری فکری نہج

1۔ الزبیدی، تاج العروس۔

(راستہ) بھی بڑی واضح ہے۔ ہمارے منابع میں قرآن کریم سرفہرست ہے۔ اس کے بعد ہم سنّت نبوی کے اُس طریق پر اعتماد کرتے ہیں جو ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا طریق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے بعد ہمارے اساسی منابع میں اصول کافی، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب الاحکام، الاستبصار، نہج البلاغہ اور صحیفۂ کاملۂ سجّادیہ شمار ہوتے ہیں۔ اِن منابع سے دینی تعلیمات کے اخذ و استخراج میں ہماری روش بھی بڑی روشن ہے۔ ہم مکتبِ تشیّع کے اندر اُس فکری روش کے علمبردار ہیں جس کے بہترین نمائندہ حضرت امام خمینیؒ ہیں۔

الحمد للہ! ہمارا ادارہ اپنی فعالیت کے تقریباً چھ سالوں میں حیاتِ فاطمہ (س)، تعلیم الاحکام، امام خمینیؒ کی ایک مغربی دانشور سے ملاقات، حضرت زینب (س)، تاریخ کا ایک ناگزیر کردار، اسلامی پردہ، سول سوسائٹی، امام خمینیؒ کا سیاسی نظریہ، قرآن اور نفسیاتی دباو، معجزہ کیا ہے؛ حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت اور تعلیمات جیسی قابل ذکر مطبوعات، علمی حلقوں کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ، "پیام قرآن" جیسی عظیم موضوعی تفسیر کی آخری تین جلدوں کا ترجمہ اور مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" کے ۲۶ شماروں کی مسلسل اشاعت بھی "نَمت" کا ایک عمدہ کارنامہ ہے۔ "نَمت"، قرآن و حدیث، فلسفہ و کلام، اخلاق و عرفان اور دیگر متنوع موضوعات پر مکتب اہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں اردو زبان میں تحقیقی لٹریچر پیش کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اِس امید کے ساتھ کہ پاکستان کی مسلم امّت اور خاص طور پر اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مکتب کے پیروکار، اِس نہالِ تحقیق کی آبیاری میں اپنے حصّے کا چلو بھر پانی ضرور ڈالیں گے۔

ڈائریکٹر "نَمت"

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

اداریہ

نور معرفت کا چھبیسواں شمارہ آپ کے سامنے ہے، باوجود کوشش کے یہ شمارہ بھی ہم بروقت قارئین کی خدمت میں پیش نہیں کرسکے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ علمی و تحقیقی مقالات کی تیاری میں وقت درکار ہوتا ہے اور یہ عذر لکھنے والوں کی طرف سے ہمیشہ پیش کیا جاتا ہے جسے قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔یہ شمارہ محرم الحرام کے ایام میں تیار ہوا ہے لہٰذا زیادہ تر مقالات کا موضوع واقعہ کربلا اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی لازوال قربانیاں ہیں۔دوسری طرف ملک میں واقعہ کربلا کے اثرات کو مٹانے کی بھی ایک تحریک جاری ہے اور عزائے حسینی کی مجالس و محافل کو محدود کرنے کی باتیں کھلے عام کی جارہی ہیں اور حکومت بھی جانبداری کی پالیسی پر عمل کررہی ہے۔جس کی وجہ سے نظریاتی لحاظ سے بھی اس موضوع کا دفاع ایک قدرتی بات ہے۔جس کی جھلک قارئین کو اس شمارے میں نظر آئے گی۔

الحمدللہ ،امسال گزشتہ سیاسی حالات اور دھرنوں کی وجہ سے حکومت نے ملک میں سیکورٹی کے مسئلے کو ایک چیلنج کے طور پر لیا اور محرم الحرام کے دوران جدید سیکورٹی وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے امن وامان کے مسائل کو ترجیح دی۔جس کی وجہ سے عزاداری کے جلوسوں کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔لیکن دوسری جانب حکومت نے قانون کے سہارے مجالس عزااور ماتمی جلوسوں کو محدود کرنے کی بھی سعی کی۔لہٰذا اس سال بہت سے مقامات پر برسوں پرانی مجالس عزاء اور جلوسوں کو روکنے اور بانیان مجالس کو پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔جس سے پنجاب حکومت کی جانبدارانہ پالیسی کی عکاسی ہوتی ہے۔

نور معرفت کے اس شمارے میں جو علمی و تحقیقی مقالات قارئین کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں ،اُن میں ایک تو علوم قرآن کا اہم موضوع حروف مقطعات ہے جس کا دوسرا حصہ شامل اشاعت کیا گیا ہے۔اس موضوع پر فاضل مقالہ نگار نے گزشتہ شمارے میں مفسرین اور قرآنی محققین کی آراء لکھی تھیں اور اس شمارے میں بھی اسی سلسلے کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

اس کے بعد سیرت کے سلسلے میں " پیغمبر اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے نمونے قرآنِ کریم کی روشنی میں '' کے عنوان سے ایک جاندار تحریر پیش کی جارہی ہے۔اس کے بعد '' واقعہ کربلا اور کوفیوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات '' کے عنوان سے ایک تاریخی مغالطے کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اصحاب امام حسین علیہ السلام کے لازوال کردار پر ''اصحاب حسینی کا جذبہ وفاداری '' کے عنوان سے بھی ایک مقالہ شامل کیا گیا ہے جو اس واقعہ کے شہداء کے مضبوط ایمان کی عکاسی کرتا ہے۔ بعد والے مقالے کا عنوان ہے '' عہد جاہلیت سے عہد رسالت تک بنوہاشم اور بنواُمیہ کی رقابت کا تاریخی جائزہ '' جس سے تاریخ اسلام کے ایک اہم نزاع کی حقیقت روشن ہوتی ہے۔

تکفیری گروہوں کی غیر اسلامی سرگرمیوں سے پردہ اُٹھانے والی ایک جاندار تحریر بھی '' اہل قبلہ کی حرمت تکفیر کتاب و سنت کی نظر میں '' کے عنوان سے پیش کی جارہی ہے۔ نہج البلاغہ کی تعلیمات کے شائقین کے لئے '' احکام اسلامی کا فلسفہ نہج البلاغہ کی روشنی میں '' کے نام سے ایک مقالہ اس شمارے میں شامل کیا گیا ہے آخر میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی علمی وستعوں کی عکاسی کرنے والی ایک تحریر '' آئمہ اطہارؑ کی مختلف زبانوں سے آشنائی '' نور معرفت کے اس شمارے میں شامل ہے۔حسب سابق اس شمارے کے مقالات کے خلاصہ جات کا انگلش ترجمہ فاضل دوست جناب میثم علی نے کیا ہے جس کے لئے ہم اپنے دوسرے تمام معاونین کی طرح ان کے بھی مشکور ہیں۔

گفتنی ها

حرارت قلوب مومنین

سید رمیز الحسن موسوی[1]
srhm2000@yahoo.com

اُمت مسلمہ کے نزدیک اہل بیت اطہار علیہم السلام کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ یہ مقام و مرتبہ قرآن وسنت پر ایمان رکھنے والے اور کتب سیر وتاریخ سے آگاہ کسی بھی کلمہ گو مسلمان پر پوشیدہ نہیں۔ صدر اسلام سے لے کر آج تک خاندان عصمت وطہارت کی عظمت وشرافت کو کم کرنے کی جس نے بھی کوشش کی، تاریخ شاہد ہے کہ وہ اپنے شوم مقاصد میں ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ اہل بیت اطہارؑ کے مقام و مرتبے کو اس وقت مزید چار چاند لگ جاتے ہیں، جب ۶۱ ہجری میں اس خاندان کے چشم وچراغ نواسۂ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام اپنا سب کچھ اسلام کی راہ میں قربان کرتے ہوئے اپنے خون سے اپنے نانا کے دین کی تا قیامت بقاء کا اہتمام کر دیتے ہیں۔

نہ فقط مسلمان اور اُمت رسول اللہ ﷺ بلکہ دنیا کے تمام حریت پسند امام حسین علیہ السلام سے عشق ومحبت کرتے ہیں اور ہر سال مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں غیر مسلم بھی امام حسینؑ کی یاد مناتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی اور مظلومانہ شہادت نے پوری اُمت کے دلوں میں ایک ایسی حرارت پیدا کردی ہے جو قیامت تک ٹھنڈی نہیں ہو گی۔ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ اُمت مسلمہ کے عشق ومحبت کو امام جعفر صادق علیہ السلام نے قلوب کی حرارت سے تعبیر فرمایا ہے:

اِنَّ لِقَتل الحسین علیہ السلام حَرارۃً فی قلوب المؤمنین لا تَبردُ ابداً۔

1۔ مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدی مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

یعنی: بے شک حسین علیہ السلام کے قتل کی وجہ سے مومنین کے قلوب میں ایک ایسی حرارت ہے کہ جو کبھی ٹھنڈی نہیں ہو گی۔[کامل الزیارات، ص۳۸]

ایک معصوم امامؑ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ کلمات روزبروز حقیقت اختیار کرتے جارہے ہیں۔جوں جوں انسانیت شعور وعقل کی منزلیں طے کر رہی ہے اُس پر عشق حسینؑ کی حقیقت بھی روشن ہو رہی ہے۔عاشورۂ حسینی ہر سال آتا ہے اور ہر سال انسانیت شعور کی منزلیں طے کرتی ہے اور امام حسین علیہ السلام کے عاشقوں اور محبوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔امام حسینؑ سے عشق ومحبت انسانی فطرت میں شامل ہے۔

چونکہ فطرت انسان، کمال پرست ہے جس چیز میں کمال ہو وہ اُس سے محبت کرتی ہے اور جو ہستی کمال مطلق میں فنا ہو جائے اور اپنا سب کچھ کمال مطلق پر قربان کردے اُس سے عشق بھی ایک فطری امر ہے۔لیکن فطرت انسانی سے منحرف لوگ کبھی بھی عشق امام حسینؑ کا ادراک نہیں کر سکتے۔۶۱ ہجری میں انسانی فطرت سے عاری کچھ انسان نما درندوں نے حضرت امام حسینؑ اور اُن کے جان نثاروں کے عشق الٰہی کا امتحان لینا چاہا اور بزعم خود فتح ونصرت کے نشے میں ڈوب کر اور عاشقان الٰہی کو شکست سے دوچار کرکے فتح وکامیابی کے نقارے بجانے شروع کردیے تھے اور اسی نشے میں خانوادہ نبوتؐ کی ناموس کو بازاروں اور درباروں میں ذلیل وخوار کرنے کی کوشش کی تھی۔لیکن ظاہری طاقت وفتح کے نشے میں مست ان لوگوں کی یہ غلطی رہتی دنیا تک اُن کے لئے سوہان روح بن گئی۔

لہٰذا آج انہی ظالموں کے نظریاتی فرزند اپنے بڑوں کی اس غلطی کی آگ میں جل رہے ہیں اور اس کا ازالہ عزاداری امام مظلوم کے جلوسوں اور مجالس کو روک کر کرنا چاہتے ہیں۔جلوس ہائے عزا کو روکنے والے درحقیقت یزید اور اُس کے اُن کارندوں کی اس غلطی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، جو اُنہوں نے واقعۂ عاشورا کے بعد اہل بیت اطہارؑ کے اسیروں کو سربازار ودربار لے جاکر کی تھی۔اُس وقت وہ فتح کے نشے میں نہیں سمجھ سکے کہ مظلوم اسیروں کا دربدر گھمایا جانا یزید اور اُس کے آباؤاجداد کے لئے تاقیامت رسوائی کا باعث بن جائے گا اور عشق حسینؑ کی آگ میں جلنے والے قلوب، قیامت تک بازاروں میں اس غم کی یاد مناتے پھریں گے۔

عزاداری کے جلوس یزیدیت کے خلاف صدیوں سے جاری احتجاج ہے اور ان جلوسوں کے خلاف ریشہ دوانیاں یزیدیت کا دفاع اور یزید کے ماننے والوں کا اپنے نظریاتی اجداد کی تاریخی غلطی پر پردہ ڈالنے کی

کوشش ہے۔ گزشتہ سال راولپنڈی میں ۱۴۳۵ھ کے چہلم سید الشہداءؑ کے جلوس کو روکنے والوں کو شاید اس حقیقیت کا ادراک نہیں تھا کہ اہل بیت اطہارؑ کے پیروکاروں کے خلاف ہر سازش کامیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن عشق حسینؑ کی حرارت کو اس قوم کے دلوں سے کسی بھی صورت خاموش نہیں کیا جاسکتا۔

امسال بھی جہاں حکومتی سطح پر عزائے حسینی کے جلوسوں کو چار دیواری کے اندر محدود کرنے کی ناکام سعی کی جارہی ہے وہاں واقعہ کربلا میں ملوث اُموی چہروں کے ہمدردوں کی طرف سے بھی گریہ وماتم کے بارے میں خود ساختہ فلسفے پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور آئے دن ملکی جرائد واخبارات میں گریہ اور ماتم کو غیر اسلامی فعل اور سنت وسیرت رسولؐ کے منافی عمل کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ گریہ وماتمی جلوسوں کو ملک کے امن وامان کے لئے خطرہ قرار دینے والے لکھاریوں نے گریہ کے بجائے صبر کرنے اور مردوں پر گریہ کی ممانعت پر مبنی روایات پیش کرنے کی سعی کی ہے اور فرامین رسول ﷺ کی روشنی میں گریہ کو صبر واستقامت کے برعکس قرار دیا ہے۔

لیکن مذہب اہل بیت اور سیرت رسول ﷺ سے ناآشنا ان لکھاریوں کو معلوم نہیں کی رسول اللہ ﷺ نے خود شہداپر رونے کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ تاریخ اسلام شاہد ہے جب آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تھے توآپ ﷺ نے اُن پر رونے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے کس گریہ سے منع فرمایا ہے اور کون سے مردوں پر رونے کی ممانعت فرمائی ہے؟ یہ لوگ عام شہدا تو کیا خاندان رسولؐ کے شہدا تک کو عام مُردوں کے برابر سمجھتے ہیں اور طبعی موت مرنے والوں پر بے صبری کے گریہ اور حفاظت دین میں مظلومانہ طور پر شہید ہونے والوں پر گریہ وماتم کو ایک جیسا قرار دیتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ مذہب تشیع میں گریہ وماتم کا فلسفہ کیا ہے اور ان جلوس ہائے عزا سے شیعہ کیا نتیجہ لینا چاہتے ہیں۔

کیا امام عالی مقامؑ پر گریہ وماتم، بے صبری کا گریہ ہے اور یہ پشیمانی اور ندامت کا ماتم ہے؟ شیعہ مذہب کے نزدیک ایسا ہر گز نہیں۔ تاریخ شیعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعوں نے ہر دور میں وقت کے ظالموں اور یزیدیت کے وارثوں کو اسی گریہ وماتم کے ذریعے شکست دی ہے۔ دور کیوں جاتے ہیں، انقلاب اسلامی ایران ہی کی تاریخ کو دیکھ لیجئے۔ ایران پر برسوں سے ایک ظالم حکومت مسلط تھی جس کی پشت پناہی دنیا بھر کی یزیدی قوتیں کررہی تھیں۔

یہ ظالم شاہ عالمی کفر کے سہارے ایران سے اسلام وقرآن کا نام ونشان مٹانے پر تلا ہوا تھا۔یزید جیسی خصوصیات کے اس ظالم بادشاہ کو حسینؑ پر رونے والی قوم ہی نے شکست دی ہے اور اسی حسینی گریہ وماتم کی صداؤں سے یہ ظالم وفاسق حکمران ایران چھوڑ کر بھاگا ہے۔ایران کے انقلاب میں عزاداری اور حسینی گریہ کے کردار اور عزائے حسینی کے فلسفے کے بارے میں خود رہبر انقلاب حضرت امام خمینیؒ کے بیانات قابل توجہ ہیں۔امام خمینیؒ ظلم وستم کے خلاف امام حسینؑ پر گریہ وماتم کی طاقت کے بارے میں فرماتے ہیں :

''اسلام کو اس وقت تک سید الشہداؑ نے زندہ رکھا ہے۔ سید الشہداؑ نے اپنی ہر چیز کو، اپنے جوانوں کو، مال واسباب کو اور جو کچھ بھی ان کے پاس تھا (مال ومنال تو نہیں تھا) بلکہ جوان تھے، اصحاب تھے، سب کو، راہ خدا میں دے دیا اور اسلام کی تقویت اور ظلم کی مخالفت میں، اس دور کی عظیم شہنشاہیت کے خلاف جو آج کی شہنشاہیت سے بڑی تھی، نہایت قلیل افراد کو ہمراہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اگرچہ شہید ہوگئے مگر اس کو مغلوب کر دیا اور اس نظام ظلم کو تار مار کرکے رکھ دیا۔ہم انہی کے پیروکار ہیں اور اُسی وقت سے امام جعفر صادق علیہ السلام کے حکم اور ائمہ ہدیٰ کے دستور کے مطابق مجالس عزا برپا کر رہے ہیں۔ان مجالس کو جو ظالموں کے ظلم وستم اور بیداد گری کے مقابلہ میں ہیں، ہم نے زندہ رکھا ہے۔۔۔۔اس وقت ایک گروہ ایسا وجود میں آیا ہے جو کہتا ہے کہ اب مصائب کی کیا ضرورت ہے؟ انہیں معلوم نہیں کہ مصائب یعنی چہ؟ وہ عزاداری کی ماہیت کو نہیں جانتے۔انہیں نہیں معلوم کہ یہ امام حسینؑ کی تحریک تھی جس نے ہماری تحریک کو جنم دیا ہے۔ یہ تحریک اسی تحریک کی ایک کرن ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ عزائے امام حسینؑ میں گریہ کرنا، تحریک کو زندہ رکھنا اور اس جذبہ کو زندہ رکھنا ہے، جس کے تحت چھوٹی سی جماعت، بہت بڑی شہنشاہیت سے ٹکرا گئی۔امام حسینؑ کا یہ دستور العمل ہر ایک کیلئے ہے کہ (کل یوم عاشورا وکل رض کربلا) ااس چیز کا حکم ہے کہ ہر روز اور ہر جگہ اسی تحریک کو زندہ رکھنا چاہیے اور وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔امام حسینؑ نے تعداد کم ہونے کے باوجود اپنی ہر چیز کو اسلام پر فدا کر دیا۔ایک بڑی طاقت کے مقابلہ پر ڈٹ گئے اور اس کا انکار کر دیا۔

لہٰذا ہر روز اور ہر جگہ اس انکار کو محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ مجالس عزا اسی انکار کو زندہ رکھنے کیلئے ہیں۔ ہمارے بچے اور جوان اس احساس کا شکار نہ ہوں کہ ہم رونے والی قوم ہیں۔اس چیز کو

دوسروں نے تمہارے کانوں میں پھونکا ہے کہ یہ رونے والی قوم ہے۔ وہ اسی گریہ سے خائف ہیں، اس لیے کہ یہ گریہ، مظلوم پر گریہ ہے اور ظالم کے خلاف فریاد ہے۔ ماتمی دستے جو سڑکوں پر نکل آتے ہیں، یہ ظالم کے مقابلہ میں قیام ہے۔ اس حرکت کو محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ ہمارے مذہبی شعائر ہیں جن کی حفاظت ہونی چاہیے۔ یہ ہمارے سیاسی شعائر ہیں جن کو محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ بکے ہوئے قلم تمہیں دھوکہ نہ دیں۔ یہ اشخاص جو مختلف ناموں اور انحرافی مذاہب کے تحت چاہتے ہیں کہ ہر چیز کو تم سے چھین لیں، یہ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مجالس، مظلوم کے مصائب اور ظالم کے ظلم کا تذکرہ ہر دور میں ظالم کے مقابلہ پر لا کھڑا کرتا ہے"۔

(قیام عاشورا، ص ۱۳، ۱۲)

پس امام خمینیؒ کے نزدیک امام حسینؑ پر گریہ کا مقصد ظالموں کو بے نقاب کرنا اور یزیدیت کے مبلغین کی کوششوں کو ناکام بنانا ہے۔ شیعہ جو ماتم کرتے ہیں وہ امام خمینیؒ جیسے استعمار شکن رہبر کے نزدیک ظالم سامراج کے منہ پر پڑنے والے طمانچے ہیں اور شیعوں کا ماتم کے لئے اُٹھنے والا ہر ہاتھ وقت کے یزیدوں اور ظالموں کے منہ پر پڑتا ہے۔ شیعہ بے صبری کی وجہ سے ماتم نہیں کرتے، بلکہ اپنے عزیزوں کے غم کو بھی غم حسین میں بدل ڈالتے ہیں اور اپنے مرنے والوں پر ماتم کو بھی ماتم حسینؑ میں بدل ڈالتے ہیں۔

چونکہ شیعہ کے نزدیک جو گریہ جائز ہے اور سنت رسول ﷺ ہے وہ حسین علیہ السلام جیسے مظلوم پر گریہ وماتم ہے نہ اپنے مرنے والوں پر۔ چونکہ حسینؑ پر گریہ وماتم ظلم شکن ہے اور ظالموں سے نفرت وبیزاری کا اظہار ہے۔ لہٰذا مظلوم پر گریہ وماتم کرنا ایک سیاسی وعبادی عمل ہے۔ ہمارے نزدیک عزاداری اور ماتم کو عبادت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماتم وگریہ کی مجالس در حقیقت اسلام کی بقا کے لئے ہیں۔ چونکہ امام حسین علیہ السلام نے اسلام کی بقا کے لئے شہادت قبول کی تھی لہٰذ حسینؑ مظلوم کا تذکرہ اور ماتم بھی بقائے اسلام کا باعث ہے۔

گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی جس طرح پنجاب حکومت نے عزاداری کے جلوسوں کو روکنے کی کوشش کی ایسی مکروہ کوشش پہلے کسی حکمران نے نہیں کی تھی۔ کیوں ہماری حکومتیں امریکہ جیسی ظالم اور سامراجی طاقتوں کے سہارے وجود میں آتی ہیں جو پوری دنیا میں یزیدیت کے مظالم کی وارث ہیں لہٰذا

انہی ظالموں اور سامراجی طاقتوں کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز سے ہراساں ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ عزاداری امام حسینؑ کی مجالس اور جلوسوں سے زیادہ ظلم اور ظالموں کے خلاف بڑی کون سی آواز ہو گی۔
لہٰذا اس آواز کو دبانے کے لئے جہاں بنی اُمیہ جیسے سابقہ ظالموں کے حامی قلم حرکت میں آجاتے ہیں وہاں موجودہ ظالم سامراجی قوتوں کے کارندے بھی اپنے کالے قوانین کی لاٹھی سے ظلم وستم کا بازار گرم کرنے لگتے ہیں ۔اس ملک میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ انگیز خطبات کو لاؤڈ سپیکر پر نشر کرنے پر کوئی پابندی نہیں، لیکن نواسۂ رسول کی یاد میں برپا کی جانے والی مجالس عزا کے لاؤڈ سپیکر پر پابندی ضرور ہے لہٰذا اسی متعصبانہ سیاست کے تحت امسال بیسیوں عزاخانوں کی انتظامیہ کے خلاف ایف آئی آر کاٹی گئی ہیں لیکن ایسے قوانین بنانے والوں کو معلوم نہیں کہ شیعہ ہر چیز سے رک سکتا ہے لیکن عزائے حسینی سے ہرگز نہیں رکے گا۔ چونکہ یہ مومنین کے دلوں کی حرارت ہے جسے تاقیامت ٹھنڈا نہیں کیا جاسکتا۔

روز جمعہ اور اسلامیان پاکستان کی بے حسی

ہفتے کے دنوں میں ایک جمعے کا دن ہے۔ اسلامی روایات میں جمعہ کے دن اور رات کی بہت زیادہ فضیلت ذکر ہوئی ہے اور اسے تمام دنوں کا سردار کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس دن کی اہمیت اور فضیلت کسی پر بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ہر مسلمان اس دن کو مبارک اور نیک سمجھتا ہے۔ جس طرح اتوار کا دن عیسائیوں کے لئے اور ہفتے کا دن یہودیوں کے لئے مقدس ہے اور وہ اس دن اپنی عبادات انجام دیتے ہیں اور دوسرے کاموں سے ہاتھ کھینچ کر مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں، مسلمانوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے جمعہ کا دن عبادت اور خوشی کا دن قرار دیا ہے۔
پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ایک روایت کے مطابق جمعہ کا دن عید قربان اور عید فطر سے بھی بڑھ کر ہے اور جمعہ کے دن انسان جو بھی دعا کرے وہ قبول ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے بہتر دن جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے، جمعہ کا دن ہے۔ قرآن مجید میں ایک پوری سورہ اسی کے نام سے نازل ہوئی ہے۔ جمعہ کے دن کے یہ فضائل کسی بھی پڑھے لکھے مسلمان سے پوشیدہ نہیں۔ مسلمان روز جمعہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس دن تعطیل کرتے ہیں اور دنیوی کاموں سے ہاتھ کھینچ کر روز جمعہ کے مستحبات وسنن کو ادا کرتے ہیں لہٰذا نماز جمعہ کے اجتماعات میں شرکت ہر مسلمان اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے۔

جمعہ کی نماز فرضِ ہے اور اس کی فرضیت ظہر سے زیادہ موکد ہے۔ یعنی ظہر کی نماز سے اس کی تاکید زیادہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو تین جمعے سستی کی وجہ سے چھوڑے اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر کر دے گا اور ایک روایت میں ہے وہ منافق ہے اور اللہ سے بے علاقہ اور چونکہ اس کی فرضیت کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے للذا اس کا منکر کافر ہے۔

پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے جس کے عوام بھی اسے اسلامی مملکت سمجھتے ہیں اور حکمرانوں کا بھی دعویٰ ہے کہ یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ بچوں کو پاکستان کی تاریخ میں بھی یہ پڑھایا جاتا ہے کہ یہ ایک نظریاتی مملکت ہے اور اسے اسی اسلامی نظریہ کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہے۔ جس کا لازمہ یہ ہے کہ اس میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تمام نشانیاں اور علامتیں پائی جانی چاہییں۔

روز جمعہ کے اعمال، نماز اور دوسری رسوم سے بڑھ اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت کی علامت اور کیا چیز ہو گی۔ لیکن پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں اسلامی ثقافت کی اس علامت کو نمایاں کرنے کے بجائے، مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے اور یہ کام تشکیل پاکستان کے آغاز ہی کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ جہاں دوسری اسلامی علامتوں اور ثقافتوں کے نقوش مٹائے گئے ہیں وہاں نماز جمعہ کو بھی سرکاری سطح پر بے اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اس دن کی چھٹی کے بجائے عیسائیت کے نزدیک اہمیت کے حامل دن اتوار کو سرکاری چھٹی رکھی گئی ہے۔

عالم اسلام کے تمام مفکرین اور دانشور پاکستان کو ایک اسلامی نظریاتی مملکت قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دنیائے اسلام کے نامور دانشور آیت اللہ شہید مرتضٰی مطہریؒ پاکستان کے اسلامی نظریاتی مملکت ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں جمعہ کے بجائے اتوار کی چھٹی پر اظہار تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جمعے کی تعطیل کا مسئلہ بھی اُن مسائل میں سے ہے جو بعض اسلامی ممالک میں جب سے استعمار آیا ہے اس نے اسے تبدیل کر دیا ہے۔ مثلاً پاکستان (کو دیکھ لیں) انگریزوں نے ہندوستان میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کوشش کی ہے کہ اس کی تمام رسوم کو اپنی رسوم میں تبدیل کر دیں۔ جن میں سے ایک یہ کہ اُنہوں نے جمعہ کی تعطیل کو اتوار کی تعطیل میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب بھی پاکستان میں اسی طرح ہے۔ جب ایک چیز تبدیل ہو جائے تو پھر اُسے دوبارہ اپنی جگہ پر لانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

پاکستان بنیادی طور پر اسلام کے نام پر آزاد ہوا ہے۔یعنی پاکستان ،ہندوستان کے مقابلے میں کوئی ایسا پہلو نہیں رکھتا تھا کہ جس کی بنا پر وہ اس سے الگ ہوتا سوائے معنوی، روحانی، فکری اور ایمانی پہلو کے۔یعنی ہم مسلمان ہیں اور تم ہندو ہو اور معنوی ثقافت کے لحاظ سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہیں، ہم تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتے لہٰذا ہم مستقل اور آزاد رہنا چاہتے ہیں۔لیکن ہندوؤں کے مقابلے میں اس قدر استقامت دکھانے کے باوجود عیسائیت کی یہ رسم (اتوار کے دن کی چھٹی) ابھی تک ان میں باقی ہے۔ان کے سال کا آغاز بھی اسی عیسوی سال سے ہوتا ہے اور ہفتہ وار تعطیل بھی اتوار کو ہوتی ہے!!"

(آشنائی باقرآن، ج ۷، ص ۸۶، ۸۵)

اسلامیان پاکستان اور اس اسلامی مملکت کے دعوی دار حُکام سے آیت اللہ مطہری شہیدؒ کا یہ گلہ بجا ہے کہ ہم نے لاکھوں انسانوں کی قربانی دے کر یہ ملک اسی مقصد کے تحت حاصل کیا تھا کہ یہاں ہم اپنی تہذیب وثقافت کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ وہ تہذیب وثقافت کے جو ہماری دنیوی زندگی کی پیشرفت کے علاوہ ہماری اُخروی اور معنوی سعادت کی بھی ضامن ہے۔ لیکن لاکھوں قربانیاں دینے کے بعد ہم اس مقصد کو بھول چکے ہیں اور بیسیوں دوسری اسلامی ودینی علامتوں کی طرح جمعہ کی تعطیل کو بھی بھولے ہوئے ہیں اور غیر اسلامی ثقافت کے مطابق تعطیل کرکے اپنے زعم میں پیشرفت کی منازل طے کر رہے ہیں۔

جمعہ کی تعطیل کے سلسلے میں ہمارا حکمرانوں سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ کیونکہ قوم کا ہر فرد جانتا ہے کہ حکمران طبقہ اسلام سے ناآشنا اور اسلامی جذبات واحساسات سے عاری ہے۔ لیکن جمعہ اور دوسرے اسلامی ثقافتی مظاہر کے تباہ ہونے پر اسلامیان پاکستان خصوصاً مذہبی طبقات پر تعجب ہے کہ اس سلسلے میں وہ اس قدر بے حس کیوں ہو چکے ہیں۔ مزید تعجب اس بات پر ہے کہ ہمارے علمائے دین جو ہر محلے میں نماز جمعہ قائم کرتے ہیں، وہ اس نماز میں مسلمین کی شرکت کے راستے میں موجود رکاوٹوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے! جمعے کے دن پاکستانیوں کی اکثریت دفاتر اور دوسرے اداروں میں مشغول ہونے اور محدود وقت کی وجہ سے بمشکل نماز جمعہ میں شریک ہو پاتی ہے اور پھر اکثریت نماز جمعہ کے مستحبات جن میں سب سے اہم غسل جمعہ ہے، سے محروم رہ جاتی ہے اور صفائی جو ہمارے دین میں نصف ایمان ہے اور جس کا سب سے بڑا مظہر غسل جمعہ ہے، وہ جمعہ کے بجائے اتوار کے دن انجام پاتا ہے۔

جمعہ کی تعطیل نہ ہونے کی وجہ سے ہماری جوان نسل اس دن کی برکات سے مکمل طور پر محروم رہ جاتی ہے، چونکہ وہ اس دن اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں بند ہوتی ہے۔ اب تو ہماری جوان نسل اور بچے جمعہ کے دن کی اہمیت اور تقدس کو بھولتے ہی جارہے ہیں اور اُن کی نظر میں اس دن اور ہفتے کے دوسرے دنوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ اس دن کی کوئی مذہبی و دینی حیثیت ہے۔ اتوار کا دن کھیل یا دوسری سرگرمیوں میں گزر جاتا ہے۔ حتیٰ مذہبی طبقات بھی اپنی مذہبی رسوم تک اتوار کے دن انجام دینے لگے ہیں اور شادی بیاہ کے علاوہ ختم قرآن، میلاد اور مجالس عزا جیسی مذہبی مجالس و محافل بھی اتوار ہی کو انجام پاتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ کہ دینی تہذیب و ثقافت کے علمبردار بعض دینی مدارس اور ادارے بھی جمعہ کے بجائے اتوار کو بند ہوتے ہیں اور فقہ اسلامی میں جمعہ کے واجبات و مستحبات اور اعمال کا درس دینے والے خود غیر اسلامی ثقافت کے مروج بنتے ہوئے جمعہ کو کھلے رہتے ہیں اور اتوار کو بند ہوتے ہیں اور اس طرح ندانستہ طور پر مسلمانوں کی ثقافت کو تباہ کرنے میں کفار و مشرکین کے مدد و معاون بن جاتے ہیں۔ یہاں کوئی شخص یہ توجیہ پیش کرسکتا ہے کہ دین اسلام میں تعطیل کا کوئی تصور نہیں ہے اور سورہ جمعہ میں بھی نماز جمعہ کے بعد اپنا کاروبار اور تجارت شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ) لیکن پھر اتوار کے دن یہ دینی مدارس کیوں چھٹی کرتے ہیں اور غیر اسلامی ثقافت کی تقویت کا باعث کیوں بنتے ہیں؟

یہ ہماری کمزوری ہے اور دشمنان اسلام کی طرف سے ثقافتی یلغار کے سامنے جھکاؤ اور نرمی کی علامت ہے۔

دوسری جانب حکمران طبقہ اور سیکولر عناصر یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ اتوار کے بجائے جمعہ کے دن تعطیل اقتصادی اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، چونکہ پوری دنیا میں اقتصادی اور تجارتی مراکز جمعہ کو کھلے ہوتے ہیں اور اتوار کو بند ہوتے ہیں۔ لہٰذ جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے ملک کا معاشی نقصان ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو جیسے سیکولر حکمران نے اتوار کی چھٹی ختم کرکے جمعہ کی چھٹی رائج کی تھی، لیکن نواز شریف جیسے بظاہر دیندار وزیر اعظم نے معاشی نقصان کے بہانے جمعہ کی چھٹی ختم کرکے دوبارہ اتوار کی چھٹی کرکے پاکستان میں اسلامی ثقافت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ معیشت کی ترقی کے بہانے اتوار کی چھٹی کا بہانہ بنانے والوں سے عرض ہے کہ جو مسلمان ممالک مثلاً ایران اور سعودی عرب جمعہ کی تعطیل

کرتے ہیں وہ پاکستان سے معیشت میں آگے کیوں ہیں اور پاکستان اتوار کی تعطیل کرنے کے باوجود معیشت میں پس ماندہ کیوں ہے ؟

اصل مسئلہ معیشت کا نہیں ہے بلکہ قومی وملی خود اعتمادی اور دینی اعتقاد کی کمزوری اور غیرت کی کمی کا ہے۔اور ایمان کی یہ کمزوری اور خود اعتمادی کا یہ فقدان اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ہمارے دینی اداروں کے متولی بھی جمعہ کو تعطیل کرنے میں اپنے اداروں کی ترقی رکنے کا اندشہ رکھتے ہیں حالانکہ جن کے وجود کا فلسفہ ہی دینی اقدار کا فروغ اور اسلامی ثقافت کی پیشرفت ہے، وہی اس قدر خود باوری سے محروم ہو جائیں تو کسی اور سے گلہ ہی کیا اور یہی ہمارے ملک میں دینی قدروں کے زوال کی سب سے بڑی علامت ہے۔

نماز جمعہ کے خطبات میں ہر غیر ضروری مسئلے پر حتیٰ قرآنی تعلیمات کے برعکس فرقہ پرستی کے فروغ پر تو بحث ہوتی ہے، لیکن ملک میں غیر اسلامی ثقافت اور رسوم کی روک تھام پر شاید ہی کوئی خطیبِ جمعہ بولتا ہو۔جمعہ کی اہمیت اور نماز جمعہ کے فلسفے سے بے اعتنائی ہی ہمارے اوپر سیکولر عناصر کے مسلط ہونے کا سبب ہے۔ہماری دینی اور اسلامی غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم ہر مسئلے کو بھول کر اپنی ثقافتی سرحدوں کی حفاظت کریں اور اسلامی ثقافت کی سب سے اہم علامت یعنی روز جمعہ کی فضیلت اور اہمیت کو زندہ کرنے کی سعی کریں۔اگر روز جمعہ اور نماز جمعہ مسلمانوں کے درمیان زندہ ہو جائے تو ہم سامراج کی ثقافتی یلغار کے سامنے ایک مضبوط بند باندھ سکتے ہیں۔اور جمعہ کے سامراج شکن خطبات سے ہم ایک بار پھر اپنی سیاسی عزت نفس کو بحال کر سکتے ہیں۔

یہ کام ہمارے سیکولر اور نام نہاد مسلمان حکمرانوں کا نہیں ہے بلکہ علمائے کرام اور دینی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جمعہ جیسے اہم سیاسی اور عبادی دن کو مسلمانوں کی سیاسی عزت اور اجتماعی وقار بحال کرنے کے لئے وسیلہ بنائیں۔جس کی خاطر دین اسلام نے نماز جمعہ فرض کی ہے۔اگر علمائے دین اور دینی ادارے یہ فریضہ ادا نہیں کریں گے اور روز جمعہ کے احیا کی سعی نہیں کریں گے تو جمعہ کے بجائے عیسائیت کا مذہبی دن اتوار ہی ہماری آئندہ نسلوں کے لئے مقدس دن بن جائے گا اور ہم اپنے مرحومین کے ایصال ثواب سے لے کر دوسری مذہبی تقاریب کا انعقاد تک عیسائی ثقافت کے مطابق ہی انجام دیتے رہیں گے اور پوری ملت جمعہ کی برکات سے محروم رہے گی۔اس محرومی سے ملت پاکستان کو نکالنا علمائے کرام کی ذمہ داری ہے نہ سیکولر حکمرانوں کی۔

حروف مقطعات (۲)
مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ

ثاقب اکبر*

ukhuwat@gmail.com

کلیدی کلمات: حروف مقطعات، رمز وراز، اسمائے الٰہی، قرآن میں غور وفکر، دعوت فکر، کفار

خلاصہ

قرآن مجید میں حروف مقطعات غیر معمولی ہیں۔ ایسے حروف گذشتہ آسمانی کتب میں بھی نہیں تھے۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ کہ جو لوگ آپ کی ہر بات پر اعتراض کرتے تھے، انھوں نے بھی حروف مقطعات پر اعتراض نہیں کیا۔ البتہ کچھ یہودی علماء نے اس پر تعجب کا اظہار ضرور کیا ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں مقالے کی پہلی قسط میں علمائے متقدمین و متاخرین کی سات آراء پیش کی گئی ہیں۔ اب کچھ مزید مطالب پیش خدمت ہیں۔ ایک یہ کہ حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے مابین رمز ہیں۔ دوم یہ کہ حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔ سوم یہ کہ حروف مقطعہ نے مسلسل انسانوں کو غور وفکر میں مشغول رکھا ہے۔ شاید ان حروف کو نازل کرنے میں ایک منشا یہی ہو کہ قاریان قرآن ان میں غور وفکر کرتے رہیں تاکہ ان میں فکری گہرائی پیدا ہوتی رہے۔ البتہ یہ حروف ہر دور میں ''دعوت فکر'' کے طور پر اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ چہارم یہ کہ حروف مقطعہ معانی اور اشیاء پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت مولانا حمید الدین فراہی کا نظریہ ہے جو انھوں نے اور پھر ان کے بعد ان کے دیگر ہونہار شاگردوں نے بطور ایک احتمال کے پیش کیا ہے۔ پنجم یہ کہ یہ حروف کفار کو خاموش کرنے کے لیے سورتوں کی ابتدا میں نازل ہوئے ہیں۔ کیونکہ مشرکین ایک دوسرے کو قرآن سننے سے روکتے تھے اور جب کوئی قرآن کی تلاوت کرتا وہ شور وغوغا بلند کرتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بعض حروف کے شروع میں ان حروف کو نازل کیا تاکہ وہ انھیں سن کر خاموش ہو جائیں جب وہ ان حروف کو سنتے تھے تو ان کو عجیب لگتا تھا اور پھر وہ سننے لگتے تھے اور غور کرنے لگتے تھے۔

*۔ صدر نشین البصیرہ، اسلام آباد

مقدمہ

حروف مقطعات کا قرآن مجید میں موجود ہونا غیر معمولی ہے۔ ایسے حروف گذشتہ آسمانی کتب میں بھی دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے بارے میں زیادہ عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات پر اعتراض کے لیے تیار رہتے تھے، انھوں نے بھی حروف مقطعات کے بارے میں اعتراض نہیں کیا۔ البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے کچھ یہودی علماء نے اس پر تعجب کا اظہار ضرور کیا ہے۔ وہ آنحضرت ﷺ پر ان حروف کے نزول کے بارے میں شدید حیرت اور استعجاب میں مبتلا ہو گئے۔ حروف مقطعات کے بارے میں مقالے کی پہلی قسط میں ہم علمائے متقدمین و متاخرین کی سات آراء اور احتمالات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں حروف مقطعات کے بارے میں ضروری معلومات درج کرنے کے بعد ہم نے مندرجہ ذیل موضوعات کے بارے میں آراء پیش کی ہیں:

۱۔ یہ حروف متشابہات میں سے ہیں۔
۲۔ حروف مقطعہ سورتوں کے نام ہیں۔
۳۔ یہ حروف پورے قرآن کے نام ہیں۔
۴۔ یہ حروف فکر و عقل کے اول مخلوق ہونے کی طرف اشارہ ہیں۔
۵۔ حروف مقطعہ پیغمبر اکرم ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے ہیں۔
۶۔ یہ حروف تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔
۷۔ صحابہ کو ان حروف کا معنی معلوم تھا۔

اب کچھ مزید مطالب پیش خدمت ہیں:

۸۔ حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین رمز ہیں

حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین رموز ہیں اور ان کا معنی ہم سے پوشیدہ ہے۔ ہمارا معمول کا فہم اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس نقطۂ نظر کی تائید کے لیے ایسی آیات کو بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے جن میں ان حروف کے فوری بعد آنحضرت ﷺ سے خطاب فرمایا گیا ہے۔ مثلاً سورہ شوریٰ کی ان آیات کو ملاحظہ کیجیے:

”حٰمٓO عٓسٓقٓO كَذٰلِكَ يُوحِىٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُO “

اسی طرح سورہ یٰس کی آیات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے:

''یٰسO وَ الْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِO اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَO''

اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے استاد مطہری لکھتے ہیں:

''بعضی راعقیدہ بر آن است کہ اینہا یک سلسلہ رموزی است میان گویندہ و شنوندہ...

چنان کہ این مطلب در میان دو فرد انسان نیز رایج است۔'' (1)

''بعض کا نظریہ ہے کہ یہ کہنے اور سننے والے کے مابین رموز کا ایک سلسلہ ہے یعنی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین بعض ایسے مطالب و معارف تھے کہ جو عام لوگوں کی سطح فکر سے بالاتر تھے اور لوگ چونکہ انھیں سننے کا ظرف نہ رکھتے تھے اس لیے انھیں صریح طور پر بیان نہیں کیا گیا بلکہ راز کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں جیسے کہ رائج ہے کہ دو انسان بھی اس طرح سے کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص چاہتا ہے کہ سب لوگ بات نہ سمجھیں تو پھر وہ پیش نظر شخص سے رمزیہ صورت میں بات کرتا ہے۔''

کمال صحرائی اردکانی ''تفسیر عرفانی امام خمینیؒ از حروف مقطعہ قرآن'' کے زیر عنوان ایک مقالہ میں رقمطراز ہیں:

''امام خمینی (رح) بر این عقیدہ است کہ حروف مقطعہ علیرغم تفاسیر مختلفی کہ از آن شدہ است، از قبیل رمز بین محب و محبوب است... بعید نیست کہ فہم آن از حوصلہ بشر خارج باشد و مخصوص بہ خواص از اولیای خداوند باشد ہمان ہا کہ بہ خطاب قرآن اختصاص یافتہ اند، ہمانطور کہ وجود متشابہات برای ہمہ نیست و تأویل آنہا را ہمان ہا درمی یابند۔'' (2)

یعنی: ''اگرچہ حروف مقطعہ کی مختلف تفاسیر کی گئی ہیں لیکن یہ محب و محبوب کے مابین رمز ہیں اور کسی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ بعض مفسرین نے اپنے حدس اور اندازے سے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے اور ہر گز بعید نہیں کہ ان کا سمجھنا اور فہم بشر کے ہمت سے باہر ہو اور یہ اولیاء الٰہی میں سے خواص کے لیے مخصوص ہو، وہی کہ خطاب قرآن جن سے مختص ہے، جیسے متشابہات کا وجود سب کے لیے نہیں ہے اور ان کی تاویل وہی جانتے ہیں۔''

ملا صدرا نے بھی حروف مقطعہ کے رمز اور اشارہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ البتہ وہ یہ قبول نہیں کرتے کہ یہ فقط آنحضرت ﷺ کے لیے رمز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ رمز دیگر اہل اللہ کے لیے بھی ہے تاہم ہر ایک کے اپنے مرتبے کے لحاظ سے۔ وہ فرماتے ہیں:

"فان العناية الربانية لما تعلقك بتربية الاطفال والاولاد الملكوتية أفادلهم و رزقهم من تحف ذلك العالم و هدايا بالجنة فی كسوة الحروف المفردة والظروف المقطعة على طريقة الرمزوالاشارة لئلايطلع عليها الاغيار۔" (3)

"یہ عنایت ربانی ہے کہ اس نے تیرا تعلق ملکوتی اطفال واولاد کی تربیت سے قائم کر دیا ہے۔ اس نے انھیں اس عالم کے تحائف اور جنت کے ہدایا کے ذریعے فائدہ پہنچایا اور رزق عطا کیا، حروف مفردہ اور ظروف مقطعہ کے پیرائے میں رمز اور اشارے کے ذریعے تاکہ اغیار کو ان کا پتہ نہ چلے۔"

علامہ طباطبائی نے بھی ان حروف کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین رموز میں سے قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مقدمے کے بعد وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ثم انك ان تدبرت بعض التدبرفی هذه السور التی تشترك فی الحروف المفتتح بهامثل الميمات والرا آت والطواسين والحواميم، وجدت فی السور المشتركة فی الحروف من تشابه المضامين و تناسب السياقات ما ليس بينها و بين غيرها من السور... ويستفاد من ذلك أن هذه الحروف رموز بين الله سبحانه و بين رسوله صلى الله عليه و آله وسلم خفيت عنا لا سبيل لأفهامنا العادية اليها الا بمقدار أن نستشعر أن بينها و بين المضامين المودعة فی السور ارتباطاً خاصاً..." (4)

یعنی: "پس اگر تم ان سورتوں پر غور وفکر کرو کہ جن میں الف لام میم را، طاسین اور ح م افتتاحی حروف کے طور پر مشترک ہیں تو ان سورتوں میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے مضامین پاؤ گے اور ان کے سیاق میں بھی ایک ایسا تناسب پاؤ گے جو دیگر سورتوں اور ان سورتوں کے مابین نہیں ہے۔ اس کی تاکید ان سورتوں کے آغاز میں آنے والے ایسے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے مشابہ اور نزدیک ہیں۔ مثلاً ح م سے شروع ہونے والی سورتوں کے آغاز میں

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِيا اس کے ہم معنی آیات آئی ہیں۔ یا پھر ا ل ر سے شروع ہونے والی سورتوں کے آغاز میں تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ یا اس کے ہم معنی آیات آئی ہیں۔ یہی صورت حال طاسین سے شروع ہونے والی سورتوں کی ہے۔ جبکہ ''ا ل م'' سے شروع ہونے والی سورتوں میں کتاب سے ریب اور شک کی نفی کی گئی ہے یا اس کے ہم معنی عبارتیں آئی نہیں۔اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان حروف مقطعہ اور ان سورتوں کے مضامین کے مابین کوئی خاص ربط ہے جن کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں۔

اس کے تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ سورہ اعراف جو ا ل م ص سے شروع ہوتی ہے اس کے مضامین ان سورتوں کے جامع ہیں جوا ل م اور ص سے شروع ہوتی ہیں۔ یہی حال سورہ رعد کا ہے جو ا ل م ر سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے مضامین ان سورتوں کے جامع ہیں جن کے شروع میں ا ل م اور ا ل ر آئے ہیں۔اس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ یہ حروف اللہ سبحانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین رموز ہیں جو ہم سے مخفی رکھے گئے ہیں اور ہمارے معمول کے فہم انھیں نہیں پا سکتے، سوائے اس کے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ ان حروف اور ان سورتوں کے مضامین میں خصوصی ربط ہے جن کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں۔

ممکن ہے کوئی تدبر کرنے والا ان حروف کے مشترکات اور ان بعض سورتوں کے مضامین پر غور وفکر کرے جن کے ابتداء میں یہ آئے ہیں اور ان کا باہمی موازنہ کرے تو اس پر مزید کچھ رموز ظاہر ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے اہل سنت کے ہاں حضرت علی علیہ السلام سے جو روایت نقل ہوئی اور جس کا مجمع البیان میں بھی ذکر آیا ہے، اس معنی پر دلالت کرتی ہو۔ اس کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ہر کتاب کے کچھ اعلیٰ اور بلند مطالب ہوتے ہیں اور اس کتاب کے اعلیٰ مطالب حروف تہجی ہیں۔''

پیر محمد کرم شاہ الازہری کا بھی یہی نظریہ ہے کہ حروف مقطعہ اللہ اور رسول ﷺ کے مابین راز ہیں۔ اس سلسلے میں وہ صاحب روح المعانی کی رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الف۔ لام۔ میم مفسرین کرام نے ان حروف کی تشریح کرتے ہوئے متعدد اقوال تحریر فرمائے ہیں۔ ''میرے نزدیک احسن قول یہ ے کہ الم اور دیگر حروف مقطعات سر بین اللہ و رسولہ۔ یہ

وہ راز ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان ہیں۔ صاحب روح المعانی کی یہ عبارت ملاحظہ ہو۔ فلا یعرفه بعد رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وآله وسلم الا الاولیاء الورثة فهم یعرفونه من تلك الحضرة وقد تنطق لهم الحروف کما کانت تنطق لمن سبح فی کفه الحصی: یعنی ان حروف کا صحیح مفہوم نبی کریم ﷺ جانتے ہیں اور اولیاء کاملین۔ ان کو یہ علم بارگاہ رسالت سے عطا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ حروف خود اپنے اسرار کو اولیاء کرام سے بیان کردیتے ہیں جیسے یہ حروف اس ذات پاک سے گویا ہوتے تھے جس کی ہتھیلی میں کنکریوں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی تھی۔" (5)

۹۔ حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں

یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسماء پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ علماء نے مختلف حروف کو مختلف اسماء پر دلالت قرار دیا ہے۔ یہی صورت حال اس سلسلے کی مرویات میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا اسماء پر دلالت کرنے کا نظریہ اختیار کرنے والوں کے ہاں دلالت پر اتفاق نہیں ہے۔ یہ قول قدماء کے ہاں بھی شد و مد سے نظر آتا ہے اور متاخرین کے ہاں بھی۔ حروف مقطعہ کے بارے میں مختلف اقوال درج کرتے ہوئے علامہ طبرسی دوسرا نظریہ ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:

"أن المراد بها الدلالة علی أسماء الله تعالی فقوله تعالی (الم) معناه أنا الله أعلم (والمر) معناه أنا الله أعلم وأری (والمص) معناه أنا الله أعلم وأفصل والکاف فی کهیعص من کاف والهاء من هادٍ والیاء من حکیم والعین من علیم والصاد... ومعناه من الالفة فکما أن الله عزوجل سبب الفة الخلق فکذلك الألف علیه تألفت الحروف وهو سبب الفتها۔" (6)

یعنی: "ان سے مراد یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء پر دلالت کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے قول (الم) کا معنی ہے أنا الله أعلم (میں اللہ بہتر جانتا ہوں) اور المر کا معنی ہے أنا الله أعلم وأری یعنی میں اللہ بہتر جانتا اور بہتر دیکھتا ہوں اور والمص کا معنی ہے أنا الله أعلم وأفصل یعنی میں اللہ بہتر جانتا اور بہتر فیصلہ کرتا ہوں اور کہیعص میں کاف کافٍ سے اور ھاھادٍ سے اور یا حکیم سے اور عین علیم سے اور صاد صادق سے ہے۔ یہ روایت ابن عباس سے ہے اور ابن عباس سے

یہ بھی روایت ہے کہ الم میں الف اسم اللہ پر دلالت کرتا ہے اور لام جبرائیل علیہ السلام پر اور میم اسم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔" نیز ابو اسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر میں علی ابن موسی رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ امام جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے الم کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ الف میں اللہ تعالیٰ کی چھ صفات ہیں: "الابتدا" پس اللہ نے تمام خلق کی ابتدا کی اور الف سے حروف کی ابتدا ہوتی ہے، "الاستواء" پس اللہ عادل ہے، ظالم نہیں ہے اور الف بھی اپنی ذات میں مستقیم اور سیدھا ہے، "الانفراد" پس اللہ فرد اور اکیلا ہے اور الف بھی اپنی ذات میں تنہا ہے۔ "اتصال الخلق بالله" پس اللہ اپنی مخلوق سے متصل نہیں ہے، سب اللہ کے محتاج ہیں اور اللہ سب سے غنی اور بے نیاز ہے جب کہ الف بھی دیگر حروف سے ملا ہوا اور متصل نہیں ہے جب کہ دیگر حروف اس سے پیوستہ ہیں اور وہ اپنے غیر سے منقطع ہے اور اللہ بھی اپنی تمام صفات کے ساتھ اپنی مخلوق سے متباین ہے اور اس کا ایک معنی الفت سے مشتق ہے کیونکہ وہ دیگر حروف کی ترکیب و تالیف کا سبب بنتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ خلق اور عالم کی ترکیب و تالیف کا سبب ہے۔"

محمد علی محمدی نے ایک مقالہ "حروف مقطعہ در نگاہ عرفا" سپرد قلم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے عین القضات کے افکار کو نسبتاً تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عین القضات نے حروف مقطعات کی تاویل بیان کرتے ہوئے ایک یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے:

"خدا را صفاتی است۔ آن صفات گاهی با الفاظی نظیر قدرت و ارادت و علم وحیات و۔۔۔ بیان می شوند۔ و گاه الفاظ۔ کما هوحقه۔ مناسبت با آن صفات ندارند۔ بنا بر این بجای الفاظ و کلمه ها، حروف مقطعه می آید۔" (7)

"خدا تعالیٰ کی صفات ہیں۔ یہ صفات گاہے الفاظ کی صورت میں مثلاً قدرت، ارادہ، علم، حیات وغیرہ سے بیان کی جاتی ہیں اور گاہے الفاظ کے ذریعے کماحقہ، بیان نہیں کی جاسکتیں کیونکہ ان کے لیے مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے الفاظ اور کلمات کے بجائے حروف مقطعہ آتے ہیں۔"

غلام احمد پرویز نے بھی حروف مقطعہ کے بارے میں اسی نظریے کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک میری بصیرت، میری راہنمائی کرتی ہے، یہ (باستثنائے چند) خدا کے اسم ذات (اللہ) یا اس کی صفات (الاسماء الحسنیٰ) کے الفاظ سے تراشیدہ حروف ہیں۔ مثلاً الم میں الف، اللہ کے لیے ہے۔ لام، علیم کے لیے اور میم، حکیم کے لیے۔ ان میں یہ ضروری نہیں کہ یہ ان الفاظ کے پہلے حروف ہی ہوں۔

تعین مفہوم کے لیے ان الفاظ میں سے کوئی سا حرف بھی لیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم نے صوتی اعتبار سے بھی انسان کے ذوق لطیف کی رعایت رکھی ہے، اور (میرے احساس لطیف کا اشارہ ہے کہ) ان حروف کے انتخاب میں یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ انداز، جس کی رو سے میں نے (مفہوم القرآن میں) حروف مقطعات کا مفہوم متعین کیا ہے۔ اس اعتبار سے الم کا مفہوم ہوگا: اللہ علیم و حکیم کا ارشاد ہے۔۔۔" (8)

ان حروف کے اسمائے الٰہی ہونے کے حوالے سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں البتہ مقطعہ صورت میں اس طرح سے کہ اگر کوئی انھیں ترکیب دے سکے تو اللہ کا اسم اعظم اس کے ہاتھ آجائے گا۔ جیسے "الر"، "حم" اور "ن" کو ملایا جائے تو "الرحمان" بنتا ہے۔ اسی طرح تمام حروف لیکن ہم انسان اس پر قادر نہیں ہیں یہ مطلب سعید ابن جبیر سے مروی ہے۔ اگرچہ اس قول کے حوالے سے ہم نے علامہ طبرسی کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی بعض روایات کا ذکر آیا ہے، اسی طرح ابن عباس کی بھی چند روایات نقل کی گئی ہیں تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند مزید روایات بھی اس سلسلے میں ذکر کردی جائیں۔ اس موضوع سے متعلق بیشتر روایات آیۃ اللہ جوادی آملی نے اپنی تفسیر "تسنیم" کی پہلی جلد میں حروف مقطعہ کی بحث کے آخر میں "بحث روائی" کے زیر عنوان نقل کردی ہیں۔ ہم اصل متون سے مطابقت دیکھنے کے بعد وہیں سے چند روایات نقل کرتے ہیں:

عن الصادق(علیه السلام): الألف حرف من حروف دل علی قولك "الله" و دل باللام علی قولك "الملك العظيم القاهر للخلق أجمعين" و دل بالميم علی أنه "المجيد المحمود فی كل أفعاله..."

یعنی: "امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ الف، حروف میں سے ایک حرف ہے جو تمھاری زبان میں "اللہ" پر دلالت کرتا ہے اور لام تمھاری زبان میں "الملك العظيم القاهر للخلق اجمعين" پر دلالت کرتا ہے اور میم "المجيد المحمود فی كل افعاله" پر اللہ نے یہ بات یہود پر

حجت قرار دی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے جب موسیٰ بن عمران علیہ السلام اور ان کے بعد نبیوں کو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیا تو ان میں سے کوئی ایسا گروہ نہ تھا جن سے اللہ نے عہد و پیمان نہ لیا ہو کہ وہ محمد عربی امی پر ایمان لائیں گے جب وہ مکہ میں مبعوث ہوں گے وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں گے۔ وہ ایسی کتاب لے کر آئیں گے جس کی بعض سورتیں حروفِ مقطعہ سے شروع ہوں گی۔ ان کی امت اسے یاد کرے گی اور کھڑے بیٹھے اس کی تلاوت کرے گی۔"

ایک اور روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: "المص" کا معنی ہے "انا اللہ المقتدر الصادق"

اسی طرح راوی کا بیان ہے کہ میں نے جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (صلوٰت اللہ علیہم) سے پوچھا کہ "الر" کا معنی کیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا: اس کا معنی ہے "انا اللہ الرؤف"

ابن بابویہ نے "الر" کے معنی نے ضمن میں لکھا کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا اس کا معنی ہے "انا اللہ الرؤف"۔

سفیان بن سعید ثوری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے جعفر بن محمد علیہ السلام سے پوچھا: اے رسول اللہ ﷺ کے فرزندؑ! "کھیعص" کا معنی کیا ہے تو آپؑ نے فرمایا: اس کا معنی ہے "انا الکافی الھادی الولی العالم الصادق الوعد"۔ یعنی: "میں کافی، ہادی، ولی، عالم اور صادق الوعد ہوں۔

نیز امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے اپنی ایک دعا میں یوں کہا: اے "کھیعص" میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔" (9)

۱۰۔ حروف مقطعہ: سامان فکر انگیزی

حروف مقطعہ نے مسلسل انسانوں کو غور و فکر میں مشغول رکھا ہے۔ مفسرین اور قرآن پر غور و فکر کرنے والوں نے اس ضمن میں نئے سے نئے نکات بیان کیے ہیں۔ بعض نہایت گہرے اور عمدہ مطالب سامنے آئے ہیں۔ بعید نہیں کہ پروردگار کا ان حروف کو نازل کرنے میں ایک منشا یہی ہو کہ قاریان قرآن ان میں غور و فکر کرتے رہیں تاکہ ان میں فکری گہرائی پیدا ہوتی رہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حروف ہر دور میں "دعوت فکر" کے طور پر اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ سائنسی و انسانی علوم کی پیش رفت کے

ساتھ ساتھ قرآنی اعجاز کے بھی مختلف پرت کھلتے رہتے ہیں۔ ان میں حروف مقطعہ بھی شامل ہیں۔ ہر دور کے فکری مباحث اور فلسفی ارتقا میں بھی قرآن کی تازہ بہ تازہ ہدایت انسان کے نصیب میں رہی ہے۔ نئے سوالات اور نئے افکار کا سامنا کرنے کے لیے قرآن تازہ نکات وافکار اپنی قاریوں کے حوالے کرتا ہے۔ استاد مطہری نے اپنے دور کی مادہ پرستی کے مقابل حروف مقطعہ سے جس طرح سے استفادہ کیا ہے اور ان کے جس پہلو کی نشاندہی کی ہے وہ قرآن کے ہر دور میں تازہ عجائبات کی ایک دلیل ہے جس کی طرف امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے:

"ان القرآن ظاهره انيق و باطنه عميق، لا تفنى عجائبه ولا تنقضى غرائبه ولا تكشف الظلمات الّا به۔"

"یقیناً قرآن کا ظاہر خوبصورت اور باطن گہرا ہے، اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور اس کی حیرت ناکیاں منقطع نہیں ہوتیں اور تاریکیاں اس کی مدد کے سوا چھٹتی نہیں۔" (10)

حروف مقطعہ نے انسانی فکر کو جس طرح سے مہمیز دی ہے اس کا احساس بہت سے مبصرین کے ہاں پایا جاتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا نظریہ ہے کہ حروف مقطعہ سورتوں کے نام ہیں، البتہ ان کے معانی کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ "ان ناموں کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا بڑا مشکل ہے۔" (11)

البتہ ان کے معانی پر غور و فکر جاری رکھنے کا کیا فائدہ اور نتیجہ ہوا اس پر بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"...ہمارے بہت سے پچھلے علماء نے ان ناموں پر غور کیا اور ان کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی جستجو سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ کام بجائے خود غلط نہیں تھا اور اگر ہم بھی ان پر غور کریں گے تو ہمارا یہ کام بھی غلط نہیں ہوگا۔ اگر اس کوشش سے کوئی حقیقت واضح ہوئی تو اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوگا اور اگر کوئی بات نہ مل سکی تو اس کو ہم اپنے علم کی کوتاہی اور قرآن کے اتھاہ ہونے پر محمول کریں گے۔ یہ رائے بہر حال نہیں قائم کریں گے کہ یہ نام ہی بے معنی ہیں۔ اپنے علم کی کمی اور قرآن کے اتھاہ ہونے کا یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس احساس سے علم و معرفت کی بہت سی بند راہیں کھلتی ہیں۔ اگر قرآن کا پہلا ہی حرف اس عظیم انکشاف کے لیے کلید بن جائے تو یہ بھی قرآن کے بہت سے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہوگا۔ یہ اسی کتاب کا کمال ہے کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے دلیل راہ بنی۔" (12)

۱۱۔ حروف مقطعہ معانی اور اشیاء پر دلالت کرتے ہیں

یہ بنیادی طور پر مولانا حمید الدین فراہی کا نظریہ ہے جو انھوں نے اور پھر ان کے بعد ان کے مکتب فکر کے دیگر ہونہار شاگردوں نے بطور ایک احتمال کے پیش کیا ہے۔ ہم یہاں پر اس نظریے کو مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

مولانا حمید الدین فراہی کا نظریہ

مولانا امین احسن اصلاحی اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی کا حروف مقطعہ کے بارے میں نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے ان حروف کے متعلق استاذ امام کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انگریزی اور ہندی کے حروف کی طرح صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ یہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیاء پر وہ دلیل ہوتے تھے عموماً انہی کی صورت وہئیت پر لکھے جاتے تھے۔ مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ یہی حروف ہیں جو قدیم مصریوں نے اخذ کیے اور اپنے تصورات کے مطابق ان میں ترمیم و اصلاح کرکے ان کو اس خط تمثالی کی شکل دی جس کے آثار اہرام مصر کے کتبات میں موجود ہیں۔

ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً "الف" کے متعلق معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ "ب" کو عبرانی میں بَیت کہتے بھی ہیں اور اس کے معنی بھی "بیت" (گھر) کے ہیں۔ "ج" کا عبرانی تلفظ جیمل ہے جس کے معنی جمل (اونٹ) کے ہیں۔ "ط" سانپ کے معنی میں آتا تھا اور لکھا بھی کچھ سانپ ہی کی شکل پر جاتا تھا۔ "م" پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔"

مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورہ "ن" کو پیش کرتے ہیں۔ حرف "نون" اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں اور جو سورہ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کرکے

فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورہ کا نام ''نون'' (ن) اسی وجہ سے رکھا گیا کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بنا پر آئے ہیں۔

قرآن مجید کی بعض اور سورتوں کے ناموں سے بھی مولانا کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حرف ''ط'' کے معنی، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ اب قرآن میں سورہ طٰہٰ کو دیکھیے جو ''ط'' سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں ایک مختصر تمہید کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی لٹھیا کے سانپ بن جانے کا قصہ بیان ہوتا ہے۔ اسی طرح طسم، طس وغیرہ بھی ''ط'' سے شروع ہوتی ہے اور ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ مذکور ہے۔

''الف'' کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ گائے کے سر کی ہیئت پر لکھا جاتا تھا اور گائے کے معنی بتاتا بھی تھا۔ اس کے دوسرے معنی اللہ واحد کے ہوتے تھے۔ اب قرآن مجید میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سورہ بقرہ میں جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے، اس میں گائے کے ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دوسری سورتیں جن کے نام الف سے شروع ہوئے ہیں توحید کے مضمون میں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ مضمون ان میں خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان ناموں کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جن سورتوں کے نام ملتے جلتے سے ہیں ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض سورتوں میں تو اسلوب بیان تک ملتا جلتا ہے۔

میں نے مولانا کا یہ نظریہ، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محض اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروف مقطعات پر غور کرنے کے لیے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معانی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ محض علوم قرآن کے قدر دانوں کے لیے ایک اشارہ ہے، جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔ (13)

اس نظریے کو ایک احتمال کے طور پر یاد کرنے میں عقلاً تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن خارجی حقائق اور شواہد اس کی تائید نہیں کرتے۔ اگر اس نظریے کو قبول کر لیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے کے عربوں کو ان کے معنی معلوم ہونا چاہئیں۔ نتیجتاً صحابہ کرام کو بھی ان کے معنی کا علم ہونا چاہیے۔ اس صورت میں ان حروف کی حیثیت کسی راز اور رمز کی نہیں رہتی۔ بعض علماء نے جاہلی ادب سے بعض اشعار کے حوالے سے بھی یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربوں کی ہاں عام طور پر حروف کو بامعنی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا جبکہ شاذ امور کو عموم کے لیے سند اور دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ قبل ازیں ہم نقل کر چکے ہیں کہ مولانا مودودی کی بھی یہ رائے ہے کہ

"جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔۔۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لیے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔"

مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے احتمالی طور پر جس نظریے کا ذکر کیا ہے اس کی بھی حالت مولانا مودودی کے نظریے سے ملتی جلتی ہے لہٰذا مذکورہ بالا عبارت میں اس جملے کو ایک مرتبہ پھر ملاحظہ کیجیے :

"ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔"

مولانا مودودی کی عبارت پر مولانا سلیم اللہ خان نے جو اعتراض کیا ہے کیا وہی اعتراض مولانا حمید الدین فراہی کے نظریے پر نہیں کیا جاسکتا؟ مولانا سلیم اللہ خان کے اعتراض کے چند جملے موقع کی مناسبت سے ہم تکرار کرتے ہیں:

اگر مودودی صاحب کا موقف درست تسلیم کر لیا جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امانت و دیانت پر حرف آئے گا کہ حروف مقطعات کے معانی و مراد کا علم ہونے کے باوجود امت کو اس خزانے سے محروم رکھ

کر خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ (معاذ اللہ)۔۔۔ مودودی صاحب کے مضمون کے پیش نظر دیکھا جائے تو ایک طرف اس اسلوب کا چلن اس قدر عام تھا کہ بولنے والے کو اس کے معنی بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی دوسری طرف یہ اس قدر جلدی متروک ہو گیا کہ اپنی فہم سے سمجھنے والے بھی اپنی زندگی کے کسی حصے میں بیان کرنے سے قاصر رہے۔ کسی زبان کا اسلوب اس قدر تیزی سے بدل جاتا ہے؟ اسلوب بدلنے سے معنی بھی کلیۃً معدوم ہو جاتے ہیں؟ اس سلسلے میں تفصیلی عبارات گذشتہ صفحات میں "صحابہ کو ان حروف کا معنی معلوم تھا" کے زیر عنوان ملاحظہ کیجیے۔

جہاں تک ''ن'' کا معنی مچھلی ہونے کا تعلق ہے تو بعض حروف کے بامعنی ہونے کی مثالیں تمام حروف کے بامعنی ہونے کی سند نہیں بن سکتیں۔ نہ عربی ادب میں ایسا رواج دکھائی دیتا ہے اور نہ احادیث میں ایسے معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ مولانا مودودی اور مکتب فراہی کے علماء نے حروف مقطعہ کے بارے میں مروی روایات سے ہر گز تمسک نہیں کیا جب کہ ان میں سے بعض روایات کے معتبر ہونے کی شہادت علمائے محققین نے دی ہے۔

مولانا مودودی نے اپنے موقفات کے اثبات کے لیے جس درجے کی روایات پر عام طور پر انحصار کیا ہے اس کے پیش نظر ان کے بارے میں ہماری حیرت زیادہ ہے۔ جہاں تک مکتب فراہی کے علماء کا تعلق ہے تو وہ عام طور پر جاہلی ادب پر زیادہ انحصار کرتے دکھائی دیتے ہیں جب کہ جاہلی ادب سے زیر بحث موضوع کے لیے وہ خاطر خواہ اور اطمینان بخش دلائل پیش نہیں کر سکے۔ تاہم چونکہ انھوں نے اس نقطۂ نظر کو ایک احتمال کے طور پر پیش کیا ہے اس لیے ہم بھی اس مسئلے پر کچھ زیادہ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔

۱۲۔ یہ حروف کفار کو خاموش کرنے کے لیے نازل ہوئے

یہ حروف کفار کو ساکت کرنے کے لیے سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں کیونکہ مشرکین ایک دوسرے کو قرآن سننے سے روکتے تھے اور جہاں کہیں کوئی قرآن کی تلاوت کرتا وہ شور و غوغا بلند کرتے تاکہ کہیں کوئی قرآن کی آواز واضح طور پر نہ سن سکے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بعض حروف کے شروع میں ان حروف کو نازل کیا تاکہ وہ انھیں سن کر خاموش ہو جائیں جب وہ ان حروف کو سنتے تھے تو ان کو عجیب لگتا تھا اور پھر وہ سننے لگتے تھے اور غور کرنے لگتے تھے۔ قرآن حکیم کو سننے سے روکنے کے لیے کفار جو کوششیں کرتے تھے اس کی طرف مندرجہ ذیل آیت بھی اشارہ کرتی ہے۔

''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لاَ تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔'' (14)

ترجمہ: ''اور کفر اختیار کرنے والے کہتے تھے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب اس کی تلاوت کی جائے تو شور شرابا کرو شاید اس طرح تم غالب آ جاؤ۔''

اسی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ طبرسی نے اس امر کو نویں نظریے کے طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انها تسكيت للكفار لأن المشركين كانوا تواصوا فيما بينهم ان لا يستمعوا لهذا القرآن و أن يلغوا فيه كما ورد به التنزيل من قوله ''لاَ تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ'' الآية فربما صفروا و ربما صفقوا و ربما لغطوا لِيُغَلِّطوا النبى صلى الله عليه و آله فأنزل الله تعالىٰ هذه الحروف حتى اذا سمعوا شيئاً غريباً استمعوا اليه و تفكروا و اشتغلوا عن تغليطه فيقع القرآن فى مسامعهم ويكون ذلك سبباً موصلاً لهم الى درك منافعهم۔'' (15)

اس نظریے کے بارے میں علامہ طبرسی ہی کی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے استاد ناصر مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

''یکی از اهداف این حروف، جلب توجه شنوندگان، ودعوت آنها به سکوت و استماع بوده باشد، زیرا ذکر این حروف در آغاز سخن، مطلب عجیب و نوظهوری در نظر عرب بود، وحس کنجکاوی او را برمی انگیخت... در بعضی از آیات قرآن مانند آیه ۲۶ سوره فصلت اشاره به این مطلب شده است۔'' (16)

یعنی: ''ان حروف کا ایک مقصد سامعین کی توجہ اخذ کرنا تھا اور انھیں خاموش ہونے اور بات سننے کی دعوت دینا تھا کیونکہ کسی کلام کے شروع میں ان حروف کا آنا عربوں کے نزدیک عجیب اور نیا نیا تھا اور انسان کی جستجو کی حس اسے ایسی چیز کی طرف توجہ دینے کی تحریک کرتی ہے نتیجے کے طور پر اس کے بعد کی بات کی طرف بھی وہ توجہ دیتا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ وہ سورتیں جن کے شروع میں حروف مقطعہ آئے ہیں بیشتر مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور دشمن بہت ہٹ دھرم اور شدید تھے۔

یہاں تک کہ تیار نہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو غور سے سنیں بعض اوقات وہ اتنا شور و غوغا بلند کرتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز ان کے مابین سنائی نہ دیتی۔ قرآن حکیم کی بھی بعض آیات میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی ایک مثال سورۃ فصلت کی آیت ۲۶ ہے۔"

یاد رہے کہ سورہ حم سجدہ کو ہی سورہ فصلت کہا جاتا ہے۔ اسی کی آیت نمبر ۲۶ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اسی رائے کو بیان کرنے کے بعد استاد جوادی آملی وضاحت کے طور پر لکھتے ہیں:

"توضیح این که، بر اساس این رأی حروف مقطعه اسم نیست (اسم اعظم یا عظیم خداوند یا اسم قرآن یا اسم سوره و یا نام پیامبر صلی الله علیه و آله وسلم) بلکه حروفی نظیر حروف تنبیه است... صاحبان این رأی اختلاف کرده اند که آیا این حروف برای تنبیه پیامبر اکرم صلی الله علیه و آله وسلم است یا تنبیه مشرکان۔ (17)

یعنی: "اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس رائے کی بنیاد پر حروف مقطعہ اسم نہیں ہیں (اللہ کا اسم اعظم یا اسم عظیم، اسم قرآن، اسم سورہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام) بلکہ یہ حروف، حروف تنبیہ کی طرح ہیں۔ فرق یہ ہے کہ الا اور ھا ایسے حروف تنبیہ ہیں جو رائج اور مشہور ہیں جبکہ حروف مقطعہ ایسے حروف تنبیہ ہیں جو رائج نہیں ہیں۔ قرآن کریم کی عربی زبان پر بالاتری یہی ہے کہ ادبی پہلو کے بشمول، ہر پہلو میں اس کے ہاں نیا پن اور تازگی موجود ہے۔ جیسا کہ فخر الدین رازی آیہ شریف "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" کے ذیل میں اہل ادب و لغت کے اس شبہہ کے جواب میں کہ "تَفْعُلَة" کا وزن ثلاثی مجرد کے مصادر میں نہیں آیا۔ ایسے مواقع پر نحویوں کے تکلفات پر مجھے حیرت ہوتی ہے کیونکہ اگر انھیں کوئی مجہول شعر مل جائے کہ جو اُن کے مدعا پر شاہد ہو تو خوش ہو جاتے ہیں اور اسے ایک محکم دلیل قرار دینے لگتے ہیں جب کہ کلام الٰہی میں لفظ تَهْلُكَة کا آنا کہ جس کی فصاحت کی گواہی موافق و مخالف سب نے دی ہے، اس لفظ کی صحت پر بہتر دلیل ہے۔"

فخر الدین رازی کی مراد یہ ہے کہ یہ اشکال اس کے لیے حیثیت رکھتا ہے جس کے لیے قرآن کا وحی اور کلام اللہ ہونا ثابت نہ ہوا ہو لیکن جس کے لیے اعجاز قرآن ثابت ہو گیا ہو اس کے لیے

قرآن کریم خود ادب عربی کا عظیم ترین منبع ہے۔ للذا حروف مقطعہ کے بارے میں بھی ہم کہیں گے کہ اعجاز قرآن ثابت ہو جانے کے بعد اسے عرب کے شاعروں اور سار بانوں کے شعر و نثر کے پیمانے پر نہ رکھا جائے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ اہل عرب نے انھیں اس معنی میں استعمال نہیں کیا اس لیے یہ حروف تنبیہ نہیں ہیں۔ یہ رائے رکھنے والوں نے اس امر پر اختلاف کیا ہے کہ یہ حروف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متوجہ کرنے کے لیے ہیں یا مشرکوں کو۔(18)

جاری ہے۔۔۔

حوالہ جات

1۔ مطہری، مرتضٰی، آشنای باقرآن، انتشارات صدرا، تہران ۱۳۷۰ش، ج۱و۲، ص ۱۲۴

ttp://www.ensani.ir/fa/content/52245/default.aspx۔2

بحوالہ: امام خمینی، چہل حدیث، ص۳۵۱

3۔ ملا صدرا: الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار العقلیۃ الاربعۃ، قم، المطبعۃ العلمیۃ، ج۷، ص۴۰و۴۱

4۔ طباطبائی، سید محمد حسین، تفسیر المیزان، بیروت، لبنان، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، ۲۰۰۲، ص۹،۸

5۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، جلد اول، ص۲۹

6۔ نیز طبرسی، فضل بن حسن: مجمع البیان فی علوم القرآن، ج۱، ص ۱۱۲

http://www.maarefquran.org/index.php/page,viewArticle/linkID,8599۔7

بحوالہ: عین القضات، نامہ ھا، ۲۹۱/۲

8۔ پرویز، غلام احمد: مطالب الفرقان (لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ گلبرگ، ط سوم، دسمبر ۱۹۹۲ئ) ج۱، ص۷۱

9۔ جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسرائ، ۱۳۸۷ھ ش، ط اول) ج۲، ص ۱۱۲و ۱۱۳

10۔ نہج البلاغہ (صبحی صالح) ص ۲۲۳، خطبہ ۱۸

11۔ تدبر قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، اگست ۲۰۰۶) ج۱، ص ۸۲

12۔تدبر قرآن،لاہور، فاران فاؤنڈیشن،اگست ۲۰۰۶) ج۱، ص ۸۳

13۔امین احسن اصلاحی: تدبر قرآن، مقدمہ و تفاسیر، فاران فائونڈیشن لاہور، 2006، ج اول، ص ۸۳و ۸۴

14۔حم: ۲۶

15۔طبرسی، فضل بن حسن: مجمع البیان فی تفسیر القرآن (بیروت، دار المعرفۃ، ۱۹۸۶ئ) ج۱، ص ۱۱۳

16۔ تفسیر نمونہ، ج۶، ص ۸۷

17۔جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسرائ، ۱۳۷۸ھ ش، ط اول) ج۲، ص ۸۵و ۸۶

18۔ استاد جوادی آملی نے فخر الدین رازی کی جس عبارت کا فارسی ترجمہ ذکر کیا ہے اس کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

انی لاتعجب کثیرا من تکلفات هؤلاء النحویین فی أمثال هذه المواضع، و ذلك أنهم لو وجدوا شعرا مجهولا یشهد لما أرادوه فرحوابه، و اتخذوه حجة قویة، فورود هذا اللفظ فی کلام الله تعالی المشهود له من الموافق بالفصاحة، أولی بأن یدل علی صحة هذه اللفظة و استقامتها۔

رازی، فخر الدین ،ابو عبداللہ محمد بن عمر: مفاتیح الغیب، معروف بہ تفسیر کبیر (بیروت، دار احیاء التراث العربیہ، ۱۹۹۹ع) ج۵، ص ۲۹۴

پیغمبر اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے نمونے قرآنِ کریم کی روشنی میں

سید عقیل حیدر زیدی (مشہد مقدس)
aqeel.zaidi1968@gmail.com

کلیدی کلمات: رحمت، شدّت، اُسوۂ حسنہ، معاشرتی اخلاق

خلاصہ

اس مقالے میں قرآنِ کریم کی روشنی میں پیغمبرِ اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے بارے میں جستجو اور تحقیق کی کوشش کی گئی ہے، اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ مثبت اور منفی نمونہ ہائے عمل اور اُسوہ ہائے حسنہ نکال کر پیش کئے جائیں تاکہ انسانوں کی سیر و سلوک اور راہ و رفتار کو، گزشتہ تاریخی ادوار میں بشری اور آسمانی مکاتب و مذاہب کی ارزشمند اوصاف اور گھٹیا و پست صفات کے تناظر میں، مختلف اور متناسب نمونہ ہائے عمل پیش کرنے کے ساتھ جہت و سمت دی جاسکے۔

ہم قرآنی آیات سے الہام لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دینِ اسلام نے انسانوں کی اسی روحانی ضرورت کے پیشِ نظر بہترین الٰہی اور انسانی نمونے اور اُسوہ ہائے حسنہ پیش کئے ہیں اور پیغمبرانِ الٰہی، بالخصوص اُن میں سے دو شخصیات، حضرت ابراہیمعلیہ السلام اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی بہترین بشری و انسانی نمونے کے عنوان سے شناخت کروائی ہے۔ قرآنِ کریم حضرت محمد ﷺ کا ایک کلّی اور اجمالی وصف میں صاحبِ رحمت اور شدّت و صلابت کے عنوان سے تعارف کرواتا ہے اور یہ دونوں صفات کلامِ وحی الٰہی (قرآنِ کریم) کی نگاہ سے، رسولِ اعظم ﷺ کے اجتماعی اور معاشرتی اخلاق کے اہم ترین پہلوؤں میں سے شمار ہوتی ہیں۔

مقدمہ

اس مقالے میں قرآنِ کریم کی روشنی میں پیغمبرِ اکرم ﷺ کی رحمت اور شدّت کے بارے میں جستجو اور تحقیق کی کوشش کی گئی ہے، اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ مثبت اور منفی نمونہ ہائے عمل اور اُسوہ ہائے حسنہ نکال کر پیش کئے جائیں تاکہ انسانوں کی سیر و سلوک اور راہ و رفتار کو، گزشتہ تاریخی ادوار میں بشری اور آسمانی مکاتب و مذاہب کی ارزشمند اوصاف اور گھٹیا و پست صفات کے تناظر میں، مختلف اور متناسب نمونہ ہائے عمل پیش کرنے کے ساتھ جہت و سمت دی جاسکے۔

ہم قرآنی آیات سے الہام لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دینِ اسلام نے انسانوں کی اسی روحانی ضرورت کے پیشِ نظر بہترین الٰہی اور انسانی نمونے اور اُسوہ ہائے حسنہ پیش کئے ہیں اور پیغمبرانِ الٰہی، بالخصوص اُن میں سے دو شخصیات، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی بہترین بشری و انسانی نمونے کے عنوان سے شناخت کروائی ہے۔ قرآنِ کریم حضرت محمد ﷺ کا ایک کلّی اور اجمالی وصف میں صاحبِ رحمت اور شدّت و صلابت کے عنوان سے تعارف کرواتا ہے اور یہ دونوں صفات کلامِ وحی الٰہی (قرآنِ کریم) کی نگاہ سے، رسولِ اعظم ﷺ کے اجتماعی اور معاشرتی اخلاق کے اہم ترین پہلوؤں میں سے شمار ہوتی ہیں۔

ا۔ قرآن اور بہترین انسانی نمونہ ہائے عمل

تمام زمینی و الٰہی مکاتب و مذاہب، اپنے مطلوب اور منظورِ نظر انسان کی تربیت کے لیے اور نیز بشر کے فطری اور سرشتی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے، مناسب نمونہ ہائے عمل اور اسوہ ہائے حسنہ، اپنی ارزشمند اور پست و گھٹیا صفات کے تناظر میں پیش کرتے ہیں اور اپنے پیروکاروں کو اُن کی پیروی کرنے اور اُن جیسا بننے کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ دینِ مبینِ اسلام بھی، تشریعی اور شرعی قانون گزاری سے کہیں زیادہ، موضوعِ اخلاق اور اُس کی ارزشمند تعلیمات کی تبیین و تشریح کے لیے، اپنی کتابِ وحی (قرآنِ کریم) کی ایک چوتھائی (1/4) یعنی تقریباً ایک ہزار پانچ سو آیات میں، فضائلِ اخلاقی سے آراستہ انسانوں کی تربیت کرنے کو پیغمبرانِ الٰہیؑ، خصوصاً پیغمبرِ خاتم ﷺ کی بعثت کے اہداف اور مقاصد کے طور پر بیان کرتا ہے:

"هُوَالَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّیِّینَ رَسُولًا مِنْهُمْ یَتْلُوا عَلَیْهِمْ آیاتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتابَ وَالْحِکْمَةَ"

ترجمہ: "خداوہ ہے جس نے مکہ والوں میں خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا، ان کے نفوس کو پاکیزہ بناتا اور انہیں کتاب (قرآن) و حکمت کی تعلیم دیتا ہے" (1)

اس سب کے علاوہ، اسلام اپنے مطلوب اور موردِ پسند عملی نمونوں کے لیے عینی مشاہدے اور محسوس طور پر ایسے انسانوں کا تعارف کراتا ہے، جو بشری اور زمینی خواہشات اور تمایلات رکھنے کے باوجود، اپنے اپنے زمانے کے انسانیت کے بلند و بالا اور اسلام و قرآن کے دل خواہ درجات پر فائز تھے۔ قرآنِ کریم نے اِن عملی نمونوں کے اخلاق، اِن کی صفات اور راہ و روش کا مطالعہ کرنے اور آئیڈیل کے طور پر انتخاب کرنے کی تاکید اور سفارش کی ہے:

"وَاذْکُرْ فِی الْکِتابِ إِبْراهِیمَ إِنَّهُ کانَ صِدِّیقاً نَبِیًّا۔" (2)

ترجمہ: "اور اِس کتابِ خدا میں ابراہیم کا تذکرہ کرو کہ وہ ایک بہت سچے پیغمبر (خدا) تھے۔"

"وَاذْکُرْ فِی الْکِتابِ مُوسی إِنَّهُ کانَ مُخْلَصاً وَکانَ رَسُولًا نَبِیًّا۔" (3)

ترجمہ: "اور اس کتاب (آسمانی) میں موسیٰ کا بھی تذکرہ کرو کہ وہ میرے مخلص (بندے) اور رسول و نبی تھے۔"

"وَاذْکُرْ فِی الْکِتابِ إِسْماعِیلَ إِنَّهُ کانَ صادِقَ الْوَعْدِ وَکانَ رَسُولًا نَبِیًّا۔" (4)

ترجمہ: "اور اس کتابِ الٰہی میں اسماعیل کا تذکرہ کرو کہ وہ وعدے کے سچّے اور ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبر اور نبی تھے۔"

"وَاذْکُرْ عِبادَنا إِبْراهِیمَ وَإِسْحاقَ وَیَعْقُوبَ أُولِی الْأَیْدِی وَالْأَبْصارِ۔" (5)

ترجمہ: "اور اے پیغمبر ﷺ! ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا ذکر کیجئے، جو صاحبانِ قوت اور صاحبانِ بصیرت تھے۔"

"وَاذْکُرْ إِسْماعِیلَ وَالْیَسَعَ وَذَا الْکِفْلِ وَکُلٌّ مِنَ الْأَخْیارِ۔" (6)

ترجمہ: "اور اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کیجئے اور یہ سب نیک بندے تھے۔"

"وَاذْکُرْ فِی الْکِتابِ إِدْرِیسَ إِنَّهُ کانَ صِدِّیقاً نَبِیًّا۔" (7)

ترجمہ: "اور کتابِ خدا میں ادریس کا بھی تذکرہ کرو کہ وہ بہت زیادہ سچے پیغمبر تھے۔"

''وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ۔'' (8)

ترجمہ: ''آپؐ ان کی باتوں پر صبر کریں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کریں جو صاحبِ طاقت تھے۔''

''وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ۔'' (9)

ترجمہ: ''اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ شیطان نے مجھے بڑی تکلیف اور اذیت پہنچائی ہے۔''

اِن آیاتِ مبارکہ میں پیغمبرانِ الہیؑ اور انسانی عملی نمونوں کے نام زندہ رکھنے کے دستور کے ضمن میں اُن کے پسندیدہ اوصاف میں سے کوئی ایک وصف اور فضائل میں سے کوئی ایک فضیلت بیان کی گئی ہے تاکہ اُن کی یاد زندہ اور باقی رکھنے کی حکمت کو ذہن نشین کروائے۔

۲۔ رسولِ اعظم ﷺ بہترین اسوۂ قرآنی

دسیوں انسانی نمونوں اور اسوہ ہائے عمل کی شائستہ برگزیدہ ہستیوں کے درمیان سے، جن میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، قرانِ کریم دو افراد کو صراحت کے ساتھ بہترین اُسوہ اور نمونۂ عمل کے طور پر معرّفی کرتا ہے، ایک ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے محمد ﷺ۔

ا۔ ''قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَداً حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللهِ وَحْدَهُ...'' (10)

ترجمہ: ''تمہارے لئے بہترین نمونۂ عمل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے غیرِ خدا معبودوں سے بیزار ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کر دیا ہے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کی عداوت اور دشمنی ہے یہاں تک کہ تم خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لے آؤ۔۔۔''

۲۔ ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيراً۔''

ترجمہ: ''یقیناً تم میں سے اس شخص کے لئے رسولِ خدا ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے، جو بھی اللہ اور آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے۔'' (11)

اِن دو آیات مبارکہ کی بیانی روش اور معنی میں غور و فکر اور دقّت کرنے سے یہ مطلب آشکارا ہوتا ہے کہ اِن دونوں آیات کے اسلوب میں اختلاف اور تفاوت میں سے یہ ہے کہ ایک تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بطورِ نمونۂ عمل تعارف کرواتے ہوئے قرآنِ کریم اُن کا موحّد و خدا پرست ہونا اور اپنے نزدیک ترین مشرک رشتہ داروں سے (شرک کی وجہ سے) برائت کا اظہار کرنا، زیادہ موردِ تاکید واقع ہوا ہے، علاوہ ازیں یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لے کر تذکرہ کیا ہے، جبکہ پیغمبر اکرم ﷺ کا نمونۂ عمل کے عنوان سے تعارف کرواتے وقت، آنحضرت ﷺ کی خداوند متعال کی طرف سے رسالت اور بعثت کی تصریح کی گئی ہے اور نیز آپؐ کے نمونۂ عمل اور آئیڈیل ہونے کو، آپؐ کی خصلتوں، صفات و اوصاف اور راہ رفتار کے کسی خاص اور معیّن پہلو کے ساتھ مقیّد اور محدود نہیں کیا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبرِ عظیم الشانِ اسلام ﷺ کی رسالت و نبوّت کا ایک پہلو، آپؐ کا لوگوں کے لیے نمونۂ عمل اور اُسوہ حسنہ ہونا بھی ہے اور کیونکہ آپؐ کی رسالت، خاتمِ رسالت اور جہان کے تمام لوگوں کے لیے ہے، اس لیے خداوند متعال آپؐ کو سب لوگوں کے لیے، تمام زمانوں اور تمام مکانوں میں پیروی اور اقتداء کے لیے بہترین اور سزاوار ترین فرد سمجھتا ہے، بغیر اس کے کہ آپؐ کی زندگی کا کوئی خاص پہلو، دوسرے پہلوؤں کی نسبت اس بارے میں بہت زیادہ درخشندگی یا بہت کم شائستگی اور صلاحیت کا حامل ہو۔ (12)

اگرچہ یہ آیتِ شریفہ، جنگِ احزاب کی آیات کے سیاق میں واقع ہوئی ہے، لیکن آیت کا اطلاق اور بیانِ عام یہ ظاہر کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اُسوہ اور نمونۂ عمل ہونا، فقط جنگ میں طرزِ رہبری اور فنونِ سپہ سالاری کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسی وجہ سے مفسّرین اور قرآنی محقّقین نے اگرچہ اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں دو احتمال ذکر کئے ہیں، لیکن اُنہوں نے عام معنی کا ہی انتخاب کیا ہے، جیسا کہ زمخشری (متوفی ۵۲۸ق) کی تفسیرِ کشّاف میں آیا ہے:

"پیغمبرِ اکرم ﷺ بذاتِ خود (تمام پہلوؤں میں) اُسوۂ حسنہ، آئیڈیل اور نمونۂ عمل ہیں۔" (13)

اس پر اضافہ یہ کہ اس آیتِ شریفہ کی اَدبی شکل و صورت اور الفاظ کی ترتیب و استعمال میں چند نکات قابلِ ملاحظہ ہیں، جو رسولِ خدا ﷺ کی ہمہ گیر شخصیت سے اور خداوند متعال کے اس سیرتِ اخلاقی پیغمبرؐ کو

واضح اور نمایاں کرنے پر اصرار اور مؤمنین کو آنحضرتؐ کی سیرت کے اپنانے کی ترغیب کی اہمیت اور تاکید کو ظاہر کرتے ہیں:

۱۔ آیتِ شریفہ نے اپنے ابتدائی الفاظ میں "لام" اور "قد" کے دو حروف سے استفادہ کیا ہے اور یہ دونوں الفاظ، ادبیاتِ عرب میں اپنے بعد کے مطلب کے حتمی اور قطعی ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ پس جب یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ (لقد) استعمال کئے جائیں، تو قطعی اور حتمی ہونا دو برابر ہو جاتا ہے؛ یعنی پیغمبرِ اکرم ﷺ کا اُسوہ اور نمونۂ عمل ہونا ہر گز قابلِ شک و تردید نہیں ہے، نیز یہ تاکید دو برابر ہونے کی حدود سے بھی تجاوز کر جاتی ہے، اگر ہم "لام" کو قسم کے لیے قرار دیں۔

۲۔ لفظِ "کان" اپنے مفہوم میں، ثبوت، استمرار اور زمان و مکان سے ماوراء معنی رکھتا ہے اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کا نمونۂ عمل ہونا، اس لحاظ سے کہ آنحضرتؐ کی رسالت، خاتمیت کے متقاضی ہے، ثابت و دائم اور زمان و مکان کی قید سے وسیع تر ہے؛ یعنی حیاتِ بشری کی تاریخ کے ایک خاص عصر یا خاص جغرافیا اور فرہنگ و تمدّن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔(14)

۳۔ حرفِ "فی" کا استعمال، جو ظرف کے ایک چیز میں مستقر اور پائیدار ہونے پر دلالت کرتا ہے،(15) اس جملے "لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا وجودِ اقدس، خداوند متعال کے نزدیک بہترین نمونۂ عمل ہونے کا ظرف و محل، عمدہ اوصاف اور پاکیزہ فضائل سے سرشار اور تمام انسانی صفات اور خوبیوں پر احاطہ رکھتا ہے اور جس طرح ظرف مظروف کو اپنے اندر سمو لیتا ہے، اسی طرح پیغمبرِ اکرم ﷺ کے وجودِ قُدسی و الٰہی نے اُن تمام فضائل اور خوبیوں کو، جن کی ایک انسان کو بہترین، عمدہ اور کامل زندگی گزارنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے، اپنے اندر سمویا ہوا ہے اور آپؐ کی ذاتِ والا صفات ان تمام اوصاف و فضائل اور خوبیوں کا معدن، مخزن اور مقام ہے؛ انہی خوبیوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا (اور شاید دوسری بیانی خصوصیات کا بھی ہونا) سبب بنا کہ جار اللہ زمخشری، جو زبانِ عرب کا بلاغت و بیان شناس شخص ہے، کہتا ہے:

"اگر ہم آیت کے آخر تک ملاحظہ کریں تو دیکھیں گے کہ خداوند متعال نے کسی بھی تاکیدی اسلوب کو ترک نہیں کیا ہے۔"(16)

۴۔ جو الفاظ نمونۂ عمل کا معنی دیتے ہیں، اُن میں سے ایک ''اُسوہ'' ہے، یہ لفظ قرآن کے تعریفی الفاظ میں سے ہے اور مثبت معنی کا حامل ہے؛ یعنی نمونۂ عمل ہونے کے ساتھ ہی تعارف کروائے جانے والے شخص کی راہ و رفتار اور خصلتوں کی تائید کو بھی بیان کرتا ہے، اس لحاظ سے کہ اگر معمولی سا شک و تردید اور خدشہ بھی (کہاں یہ کہ یقین ہو) اس شخص کی راہ و رفتار، اخلاقی، روحانی اور نفسیاتی صفات کے دینی اور الٰہی ارزش منداور بے ارزش چیزوں کے درست و صحیح ہونے کی نسبت پایا جاتا ہو تو اس کو ''اُسوہ'' نہیں کہتے ہیں۔

یہ چیز خداوند متعال کی جانب سے آنحضرت ﷺ کے اخلاق و صفات اور تمام راہ و رفتار کے صحیح ہونے پر بطورِ بیمہ اور ضمانت ہے اور یہی پیغمبرِ اکرم ﷺ کی ذاتی اور اخلاقی واقعیت ہے، جو کتابِ خدا (قرآن) اور رسولِ خدا کے درمیان (کہ ہر دو تشریعی اور تکوینی لحاظ سے انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہیں) یکسانیت اور برابری کا تعلّق برقرار کرتی ہے، کیونکہ خداوند قرآنِ کریم کی توصیف کرتے ہوئے بھی فرماتا ہے:

''إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ۔۔۔'' (17)

ترجمہ: ''بیشک یہ قرآن اس راستہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔۔۔''

۳۔ رحمت اور شدّت و صلابت

رحمت اور شدّت و صلابت، جو نگاہِ ابتدائی میں دو متعارض اور ایک دوسرے سے نامناسب خصلتیں اور صفات نظر آتی ہیں، یہ دونوں پیغمبرِ عظیم الشانِ اسلام ﷺ کے اخلاق و سیرت میں دو عمدہ اور نمایاں خصوصیات کے طور پر شمار ہوتی ہیں۔

''فَبِما رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ'' (18)

ترجمہ: ''اے پیغمبر ﷺ! یہ اللہ کی (برکت اور) مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے، تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے، لہٰذا اب انہیں معاف کردو۔ ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ میں بہ یک وقت، پیغمبرِ اکرم ﷺ کا ایک طرف تو لوگوں کے ساتھ میل جول اور راہ و رفتار میں مظہرِ عطوفت، ملائم اور مہربان ہونے کے عنوان سے تعارف کرایا جاتا ہے اور یہ آیت آپؐ کی

اسی خصوصیت کو لوگوں کے آپؐ کی طرف مائل ہونے کا سبب اور مسلمانوں کے درمیان آپؐ کی محبوبیت اور قابلِ نفوذ ہونا قرار دیتی ہے اور دوسری جانب یہی آیت قاطعیت، مسالمت ناپذیری اور تصمیمات کے اجراء میں شدّت پسندی و صلابت اختیار کرنے کی آپؐ کو سفارش کرتی ہے اور اس طرح کی صفت کو خداوند متعال کی محبوب اور موردِ پسند صفت کے طور پر بیان کرتی ہے اور یہ واضح سی بات ہے کہ اگر کوئی صفت، خصلت یا راہ و رفتار خداوند متعال کی دلخواہ اور موردِ پسند ہو تو وہ اپنے پیغمبرؐ کو اس سے ضرور آراستہ فرمائے گا اور وہ اس پر عمل کرنے والا بھی ہوگا۔

رسولِ خدا ﷺ اپنی عائلی (خانوادگی)، اجتماعی اور سیاسی زندگی میں، خواہ وہ حکومتِ اسلامی کی تشکیل اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے پہلے کی زندگی ہو یا حکومتِ اسلامی کی تأسیس و تشکیل اور دینی و معنوی پیشوائی و راہنمائی کے ساتھ ساتھ سیاسی زعامت و رہبری حاصل کرنے کے بعد کی زندگی ہو، آپؐ مظہرِ رحمت و مہربانی اور نیز شدّت و قاطعیت کا عملی نمونہ تھے۔ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی ان دو اخلاقی خصوصیات کو واضح اور روشن تر درک کرنے کے لیے، ابتداء میں رحمت اور صلابت (شدّت) کے دونوں الفاظ کی معنوی شناخت حاصل کرتے ہیں اور پھر ان دونوں خصوصیات کی رسولِ اکرم ﷺ کے وجودِ مقدّس میں (بطورِ اجمالی) تبیین اور توضیح پیش کرتے ہیں۔

۱۔۳۔ رحمت اور رأفت

۱۔۱۔۳۔ رحمت کا مفہوم

"رحمت" لغتِ عرب میں "رقّتِ قلب اور مہربانی" کے معنیٰ میں ہے۔ ابنِ منظور "لسان العرب" میں لکھتا ہے کہ: "رحمت" "رقّت (نرمی) اور مہربانی" کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ اور "مرحمت" بھی اسی معنیٰ میں ہے۔ جس وقت رحمت، انسانوں کی صفت کے عنوان سے استعمال ہو اور جس وقت خداوند متعال کی صفت واقع ہو تو وہاں رحمت کے معنی میں فرق کے بارے میں ابنِ منظور مزید لکھتا ہے: "عرب زبان میں جب بھی لفظِ رحمت انسانوں کے لیے استعمال ہو تو قلب کی نرمی اور مہربانی کے معنی میں ہے، لیکن رحمتِ خداوند متعال، مہربانی، احسان اور رزق دینے کے معنی میں ہے۔" (19)

"رحمت" کے قرآنِ کریم میں استعمال کو بھی اسی معنی میں سمجھتے ہیں؛ لغت دان اور قرآن شناسِ معروف "راغبِ اصفہانی" کہتا ہے: "رحمت، مہربانی اور ایسی نرمی ہے جو موردِ رحمت واقع ہونے والے شخص کی

نسبت احسان کا تقاضا کرتی ہے، اسی وجہ سے لفظِ رحمت، کبھی فقط مہربانی (یعنی ملزوم) اور کبھی فقط احسان (یعنی لازم) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: "خدا فلاں پر رحمت کرے۔" اور چنانچہ خداوند متعال رحمت کے ساتھ متصف ہو تو اس سے مراد فقط احسان ہے، نہ رقّت اور نرمی قلب، اسی بناء پر روایت میں آیا ہے کہ "رحمت" خدا کی طرف سے انعام اور لطف و کرم اور لوگوں کی طرف سے رقّتِ قلب اور عطوفت و مہربانی ہے۔" (20)

"جار اللہ زمخشری" اسی مطلب کو قبول کرنے کے ساتھ، کہ "رحمت" کا معنی اور مفہومِ اصلی "عطوفت اور مہربانی" ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس لفظ کا خداوند متعال کے لیے استعمال مجازی اور خداوند کے اپنے بندوں پر انعام و اکرام کے معنی میں ہے، جس طرح کہ حاکم اگر لوگوں پر مہربان ہو تو اُن پر احسان اور انعام و اکرام کرتا ہے۔(21)

علّامہ سید محمّد حسین طباطبائیؒ، صاحبِ تفسیرِ گراں قدر "المیزان" لفظِ رحمت کے مفہوم کی مزید توضیح دیتے ہوئے کہتے ہیں: "رحمت، ایسا مخصوص اثر اور حالت ہے جو کسی محتاج کو دیکھنے کے وقت انسان کے دل کو عارض ہوتی ہے اور اُس شخص کو محتاج اور نیاز مند کی ضرورت اور نیاز برطرف کرنے پر وادار کرتی ہے۔ یہ معنی تجزیہ و تحلیل کے طور پر عطا اور فیض کی طرف بازگشت کرتا ہے اور اسی معنی میں خداوند متعال بھی رحمت کی صفت کے ساتھ متّصف ہوتا ہے، یعنی: رحمت خداوند کے لیے عطا اور احسان کے معنی میں ہے، نہ قلب کے متاثّر اور حالت تبدیل ہونے کے، کیونکہ باری تعالیٰ کی ذات میں متاثّر ہونا اور حالت کا تبدیل ہونا نہیں ہے۔" (22)

علّامہ طباطبائیؒ کی مفہومِ رحمت کی اِس وضاحت میں دو نکات قابلِ توجہ ہیں:

پہلا: انہوں نے منشاءِ رحمت (یعنی نیاز مند شخص کی احتیاج اور نیاز) کو رحمت کی تعریف اور مفہوم میں ضمیمہ کرکے، نتیجۃً مہربانی اور مخصوص رقّتِ قلب کو، جو نیاز مند کی ضرورت اور نیاز کو برطرف کرنے کی غرض سے عطا کرنے والے شخص پر عارض ہوتی ہے، رحمت کا نام دیا ہے۔

دوسرا: رحمت کا خداوند متعال کے لیے استعمال، علّامہ کی اس تعریف اور توضیح کی بنیاد پر مجاز نہیں ہے۔ جیسا ہم نے زمخشری سے نقل کیا ہے۔ خصوصاً یہ کہ قرآنِ کریم میں، رحمت کا زیادہ تر استعمال، ذاتِ باری تعالیٰ ہی کے مورد میں ہوا ہے، اگر خداوند متعال کے اِس صفت سے متّصف ہونے کو مجاز شمار کریں، تو

قرآنِ کریم میں اِس صفت کا زیادہ تر استعمال مجاز ہو جائے گا اور یہ کسی بھی دوسری چیز کے علاوہ، قرآن کی بلاغت کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ لہٰذا اس بناء پر علّامہ طباطبائیؒ کی نظر، رحمت کے معنی بارے میں، زمخشری کی رائے سے صحیح تر دیکھائی دیتی ہے۔

نتیجہ یہ کہ "رحمت" مہربانی اور نرمی و رقّت قلب کے معنی میں ہے، جو نیازمند شخص کے دیکھنے سے عارض ہوتی ہے اور انسان کو احسان کرنے پر اُبھارتی ہے؛ لیکن خداوند متعال کے لیے رحمت، احسان و انعام کے معنی میں ہے؛ اگرچہ وہ رقّتِ قلب اور حالت کے تبدیل ہونے کے ساتھ متّصف نہیں ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے ایک کلام میں بھی یہی خصوصیت، خداوند متعال کی رحمت کے ساتھ توصیف میں لحاظ ہوئی ہے، حضرتؑ نے فرمایا: "رَحِيمٌ لَا يُوصَفُ بِالرِّقَّةِ" (23) یعنی: "وہ ایسی رحمت والا ہے کہ جو رِقّتِ قلب کے ساتھ متّصف نہیں ہوتا۔"

جن قرآنی آیات میں خداوند متعال اِس صفت کے ساتھ تعریف اور ستائش کیا گیا ہے، اُن میں بھی یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔

۲۔۱۔۳۔ رأفت کا مفہوم

لفظ "رأفت" آیاتِ قرآن میں مجموعی طور پر گیارہ بار آیا ہے، یہ لفظ دو بار "رَأْفَة" اور نو بار "رَؤُوف" کی صورت میں اور نیز "رَحِيم" کی صفت کے ساتھ، خداوند متعال کے اسمائے حسنی میں سے ایک اسم کے عنوان سے استعمال ہوا ہے، سوائے ایک مورد کے، جس میں رسولِ خداﷺ کے نفسانی اور اخلاقی حالات کے بیان کے طور پر آیا ہے۔ عرب زبان کے دانشور، سوائے راغب اصفہانی کے، جو "رأفت" کو رحمت کے مترادف سمجھتا ہے، "رأفت" اور رحمت کے درمیان مفہوماً فرق کے قائل ہیں:

"صحاح اللغة" (24)، "اقرب الموارد" (25)، تفسیرِ تبیان میں شیخ طوسیؒ، اور مجمع البیان میں علّامہ طبرسیؒ سورۂ مبارکۂ بقرہ کی آیت ۱۴۰ کے ذیل میں "رأفت" کو شدّت رحمت کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ صاحبِ قاموسِ قرآن بھی رحمتِ شدید کو رأفت کے دو معنی میں سے ایک جانتے ہیں۔(26)

لیکن علّامہ طباطبائیؒ رأفت اور رحمت کے فرق کو مہربانی کی شدّت اور ضعف کی نظر سے نہیں، بلکہ موردِ رحمت و رأفت قرار پانے والے کی حالت اور وضعیت کے لحاظ سے سمجھتے ہیں، یعنی رحمت ہر ایک پر مہربانی کرنا ہے، لیکن رأفت کسی مصیبت میں مبتلاء اور گرفتار شخص کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا ہے۔(27)

ابن اثیر صاحب نہایہ بھی علّامہ طباطبائیؒ کی طرح، رحمت اور رأفت کے معنی کے منشاءِ فرق کو رحمت کئے جانے والے شخص کے اعتبار سے سمجھتا ہے، لیکن اس زاویئے سے کہ رحمت قبول کرنے والا ممکن ہے کہ رحمت کرنے والے کے نزدیک محبوب یا مبغوض ہو، جبکہ رأفت فقط اُس شخص کے شاملِ حال ہوتی ہے جو رحمت کرنے والے کی نظر میں موردِ محبت ہو۔(28)

جب ہم لفظِ رأفت کے قرآنی استعمال پر نظر کرتے ہیں، تو جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ یہ دو لفظ (رأفت اور رحمت) سوائے ایک مورد کے، ہمیشہ مرکب اور ایک ساتھ ذکر ہوئے ہیں اور یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف معنی رکھتے ہیں، تاکہ اصلِ عقلائی محاورہ و کلامِ عرفی کے خلاف بھی پیش نہ آئے کہ ہر لفظ اپنے جداگانہ معنی پر حمل کیا جائے، خصوصاً یہ کہ ہماری گفتگو کلامِ خداوند حکیم کے بارے میں ہے جو بلاغت و بیان کے عالی ترین مرتبہ اور ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ ان دونوں الفاظ کے استعمال کے موارد کا فرق، ان کے معنی کے فرق کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ صفتِ رأفت، ہمیشہ ایک تعریفی صفت، بلکہ جس طرح کہ پہلے اشارہ ہوا کہ خداوند متعال کے اسمائے حُسنیٰ یا صفتِ پیغمبر اکرم ﷺ اور یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی صفت کے طور پر آئی ہے۔ ماسوائے اس کے کہ فقط ایکبار نکوہش اور مذمّت کے لیے ذکر ہوئی ہے اور وہ حدِّ زنا کے اجراء کا وقت ہے:

"الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔۔۔" (29)

ترجمہ: "زناکار عورت اور زناکار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ اور خبردار دینِ خدا کے معاملہ میں کسی مروّت کا شکار نہ ہو جانا، اگر تمہارا ایمان اللہ اور روزِ آخرت پر ہے۔۔۔"

ظاہر ہے کہ زناکار مرد اور عورت، حدّ کے اجراء کے وقت، مصیبت میں مبتلاء اور گرفتار ہیں، پس اُن کی نسبت مہربانی، رأفت کہی جائے گی، نہ کہ رحمت۔ دوسری جانب یہ کہ قرآنِ کریم نے رأفت کو خداوند متعال کی صفت کے عنوان سے استعمال کیا ہے، اس لیے اس کا دائرۂ کار بہت زیادہ وسیع اور عباد (یعنی تمام بندگان) کے اضافہ کے ساتھ ہے۔ لیکن جب پیغمبر اکرم ﷺ کی صفت واقع ہوا ہے، تو فقط مؤمنین کے ساتھ تخصیص دیا گیا ہے۔

اس اختلاف کے راز کو اس چیز میں تلاش کر سکتے ہیں کہ تمام انسان، اپنی خلقت، عبودیت اور بندگی کے لحاظ سے خداوند متعال کی نسبت برابری اور یکسانیت رکھتے ہیں اور اس پہلو سے سب کے سب انسان اپنے خالق کے محبوب اور عزیز ہیں، پس خداوند متعال اُن کے بارے میں رحمت بھی رکھتا ہے اور رأفت بھی۔ لیکن پیغمبر ﷺ کی نسبت، فقط مؤمنین ہیں جو آنحضرتؐ کے محبوب ہیں، اس بناء پر پیغمبر اکرم ﷺ مؤمنین کے بارے میں رئوف بھی ہیں اور رحیم بھی، لیکن غیرِ مؤمنین کی نسبت، آنحضرتؐ رحیم ہیں، نہ کہ رئوف۔ اس ترتیب کے لحاظ سے رحمت کے معنی کا پھیلاؤ عام ہے جو دوستوں اور غیر دوستوں کو شامل ہوتا ہے، لیکن رأفت فقط، محبوب کے ساتھ لطف و مہربانی کے مورد پر صادق آتا ہے۔ یہ جو رسولِ خدا ﷺ، کا تعارف عالمین کے لیے رحمت کے طور پر کرایا گیا ہے، نہ کہ رأفت کے طور پر، شاید اسی لحاظ سے قابلِ فہم ہو۔

قرآن کے دوسرے الفاظ میں سے جو رحمت کے قریب مفہوم رکھتے ہیں، "لینت" اور "مُدارات" کے دو الفاظ کو ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۳۔۱۔۳۔ رسول اعظم ﷺ کی رحمت اور رأفت

قرآنِ کریم مختلف انداز اور گوناگوں تعبیرات کے ساتھ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحمانیت کی تصویر کشی کرتا ہے، کبھی توآپؐ کو بشریت، بلکہ تمام عالم ہستی کے لیے رحمتِ خالص اور مجسمۂ مہر و محبتِ الٰہی کے عنوان سے ذکر کرتا ہے:

۱۔ "وَما أَرْسَلْناكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعالَمِين" (30)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ ﷺ کو عالمین کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اِس آیتِ مبارکہ کا صحیح معنی و مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ "عالمین" کے معنی اور مقصود کو سمجھیں۔ عالمین، عالَم کی جمع ہے، عالَم یعنی: تمام مخلوقات؛ جوہری "صحاح اللغة" میں بیان کرتا ہے: "اَلعالَم، اَلخَلْقُ" "عالَم، یعنی تمام مخلوقات" (31) اور نیز اقرب الموارد بیان کرتا ہے: "العالَم الخَلقُ کُلُّهُ" "عالم، یعنی تمام اور جمیع مخلوقات" (32)

یہ لفظ قرآنِ کریم میں ۷۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور ہمیشہ "عالمین" کی صورت میں ہی آیا ہے اور کبھی تو اس سے تمام مخلوقات مراد ہیں، جیسے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعالَمِين" "تمام تعریفیں تمام مخلوقات اور

عالمین کے پروردگار کے لیے ہیں۔" اور کبھی تمام انسان مراد ہیں، جیسے: "۔ ۔ ۔ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذاباً لا أُعَذِّبُهُ أَحَداً مِنَ الْعالَمِين" (33) "میں اس پر ایسا شدید عذاب نازل کروں گا کہ انسانوں میں سے کسی پر نہیں کیا ہوگا۔" اور کبھی نیز ایک عصرِ واحد کے لوگ یا ایک مملکت اور سرزمینِ خاص کے رہنے والے مراد ہیں، جیسے: "۔ ۔ ۔ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعالَمِين" (34) "اور میں نے تم کو (اس زمانے یا سرزمین کے) تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے۔" اور "وَاصْطَفاكِ عَلى نِساءِ الْعالَمِين" (35) "اور (اے مریمؑ) میں نے تمہیں (اس زمانے کی) تمام عورتوں پر فضیلت دی ہے۔"

عالمین کا مفہوم سمجھنے کے لیے کہ کہاں اور کن موارد میں یہ لفظ، تمام مخلوقات کے معنی میں اور کن موارد میں تمام یا بعض انسانوں کے لیے استعمال ہوا ہے، ایک قاعدہ کلّی کے طور پر جس چیز کو قرار دیا جاسکتا ہے وہ اصل اور قاعدہ غالباً یہ ہے کہ جب بھی یہ لفظ (عالمین) صفاتِ الٰہی میں سے کسی ایک صفت کے بعد واقع ہو تو تمام مخلوقات کے معنی میں ہوگا اور اگر کسی ایک شخص یا انسانوں کے گروہِ خاص کی صفت کے عنوان سے استعمال ہوگا تو اس کا مفہوم اور معنی زمان و مکان کی قید و محدودیت کے ساتھ ہوگا۔

اس قاعدے کی بنیاد پر، موردِ بحث آیت (وَما أَرْسَلْناكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعالَمِين) میں، عالمین کے معنی کی تشخیص و شناخت، کسی حد تک دشوار اور سخت تر ہو جاتی ہے اور گویا اسی سبب کی وجہ سے ہے کہ قرآن کے مترجمین اور مفسّرین اس آیت کے بارے میں اختلافِ نظر کا شکار ہوئے ہیں، کیونکہ موردِ نظر آیتِ مبارکہ، اس لحاظ سے کہ ایک انسان (پیغمبرِ اکرم ﷺ) کی صفت کو بیان کر رہی ہے، تو ضروری ہے کہ "عالمین" انسانوں کے ایک گروہ- جزیرہ نما عربستان کے لوگوں یا پیغمبرِ اکرم ﷺ کے ہم عصر لوگوں- کو شامل ہو اور یا حدِّ اکثر تمام انسانوں کو شامل ہو؛ اور دوسری طرف کیونکہ پیغمبرِ اکرم ﷺ رحمتِ الٰہی کے عنوان سے توصیف کئے گئے ہیں اور رحمتِ خداوندی کی شان و منزلت، اُس کی دوسری صفات کی طرح، عام اور وسیع ہے (جو سب مخلوقات کو شامل ہے)۔

لہٰذا گزشتہ قاعدۂ کلّی کے پیشِ نظر اور نیز دوسری آیاتِ قرآنی اور روایات کی نصوص کا ملاحظہ کرتے ہوئے کہ جو رسول اکرم ﷺ کا پروردگارِ عالم کی تمام مخلوقات کے لیے وسیع و عریض رحمت کے عنوان سے تعارف کرواتی ہیں، اس آیتِ شریفہ میں بھی "عالمین" تمام مخلوقات کے معنی میں ہے اور رسولِ خدا ﷺ تمام مخلوقات پر خداوند متعال کی رحمتِ خالص ہیں۔

۲۔ ''فَبِما رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ'' (36)

''اے پیغمبر ﷺ! یہ اللہ کی (برکت اور) مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے، تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے، لہٰذا اب انہیں معاف کردو، ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

فخر رازی اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں بیان کرتا ہے:

''پیغمبرِ اکرم ﷺ کو مبعوث بہ رسالت کرنے کی غرض یہ ہے کہ آنحضرتؐ تکالیفِ الٰہیہ کو لوگوں تک ابلاغ کریں اور پہنچائیں اور یہ غرض و ہدف اس وقت تک متحقّق نہیں ہوسکتا جب تک کہ لوگوں کے دل پیغمبرِ اکرم ﷺ کی طرف مائل نہ ہوں اور اُن کو آنحضرتؐ کے محضر میں روحانی و نفسانی سکون حاصل نہ ہو۔ اس طرح کے مقصد کے پورا ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ رسولؐ، رحمت، کرامت اور بزرگواری کے مالک ہوں، لوگوں کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر کریں، اُن کے ناروا اور غیر مناسب سلوک سے چشم پوشی کریں اور اُن کے ساتھ مختلف انداز سے نیک، کریمانہ اور مشفقانہ سلوک روا رکھیں۔

مذکورہ دلیل ہی کی روشنی میں، پیغمبرِ اکرم ﷺ کے لیے ضروری ہے کہ بداخلاقی اور تُند مزاجی سے مبرّاء اور دور ہوں اور اسی طرح سخت دل اور قسی القلب بھی نہ ہوں، بلکہ کمزوروں کی مدد اور فقیروں کی دادرسی کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ مائل ہوں اور اُن کی لغزشوں اور ناروا سلوک سے بھی چشم پوشی کریں۔'' (37)

۳۔ ''خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجاهِلِينَ'' (سورۂ اعراف، آیت ۱۹۹)

ترجمہ: ''آپ عفو کا راستہ اختیار کریں، نیکی کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کشی کریں۔''

علّامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ اس آیتِ مبارکہ سے اپنے فہم اور نتیجہ گیری کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''کسی چیز کے ''اَخذ'' کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کا لینے اور اختیار کرنے والا، ہمیشہ اس چیز کو اپنے ساتھ رکھے اور ہرگز ترک نہ کرے؛ اس لحاظ سے عفو و درگزر کا اختیار کرنا، یعنی یہ کہ پیغمبرِ

اکرم ﷺ اپنی نسبت بدرفتاری اور ناروا سلوک کو ہمیشہ پوشیدہ رکھیں (اور درگزر کریں) اور انتقام جوئی سے۔ جو عقلِ اجتماعی کو رُو سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں جائز شمار کی جاتی ہے۔ چشم پوشی کریں۔

البتہ یہ راہ و رفتار، دوسروں کی خود پیغمبرِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی نسبت ناروا سلوک روا رکھنے اور اُن کے ذاتی حقوق ضائع کرنے کے لحاظ سے ہے؛ لیکن اگر پیغمبرِ اکرم ﷺ کے ساتھ ناروا سلوک، دوسروں کے حقوق ضائع کرنے کا موجب بنے تو اس مورد میں درگزر کرنا اور بخش دینا ہرگز جائز اور روا نہیں ہے، کیونکہ ایسا عمل، ناروا سلوک روا رکھنے والے شخص کی نسبت گمراہی اور فریب خوری کا پیش خیمہ، دوسروں کے حقوق ضائع ہونے اور معاشرے کو محفوظ اور برقرار رکھنے والے قوانین کے باطل کرنے کا موجب بنے گا۔ وہ تمام قرآنی آیات، جو ظلم و ستم، فتنہ و فساد، ستمگروں کی مدد کرنے اور اُن پر بھروسہ کرنے سے منع کرتی ہیں، اس طرح کی عفو و درگزر کو جائز قرار نہیں دیتی ہیں۔"

علّامہؒ آیت شریفہ کے آخری حصّے "وَأَعْرِضْ عَنِ الْجاهِلِين" کے ذیل میں بیان کرتے ہیں:

"یہ جملہ خداوند معتال کی طرف سے ایک دوسرا دستور العمل ہے، جو ایسے افراد کی نسبت مسالمت اور نرم رویہ اختیار کرنے کے بارے میں ہے جو آنحضرتؐ کے ساتھ ذاتی طور پر ستم روا رکھتے تھے اور یہ جاہلانہ عمل کے آثار محو کرنے اور اُن کے کردار کے فساد کو کم کرنے کے لیے بہترین اور عمدہ ترین روش ہے؛ کیونکہ جاہلانہ عمل کے مقابلے میں مساویانہ انداز کا ردّ عمل، جاہلوں (کی جہالت) کو بڑھاوا دینے اور جاہلانہ سلوک کو ہمیشگی اور دوام دینے کا موجب بنتا ہے۔" (38)

۴۔ "لَقَدْ جاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ ما عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ" (39)

ترجمہ: "یقینا تمہارے پاس وہ پیغمبرؐ آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس پر تمہاری ہر مصیبت شاق گزرتی ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے۔"

اِس آیتِ شریفہ میں قابلِ ملاحظہ نکات میں سے ہے کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ دو ایسی صفات "رؤوف اور رحیم" کہ جو خداوند متعال کی مخصوص صفات میں سے ہیں ــ کے مالک بیان ہوئے ہیں اور خدائی انداز سے تعریف و ستائش کئے گئے ہیں۔ تمام انسانوں، انبیاءؑ و رسلؑ اور صالحین وغیرہ میں سے فقط پیغمبرِ اکرم ﷺ وہ انسان (کامل) ہیں کہ جن کی ان دو صفات کی ترکیب کے ساتھ توصیف و تمجید کی گئی ہے۔ متونِ روایات اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کی سیرت و کردار، کہ جو تعلیماتِ قرآنی کی مکمل تشریح اور آئینہ تمام نما ہیں، آنحضرتؐ کی رأفت، رحمت و مہربانی سے سرشار اور بھرے پڑے ہیں، یہاں ہم دونوں (روایات اور سیرت و کردار) میں سے ہر ایک کے چند نمونے مطلب کی تائید اور مذکورہ آیات کی مزید توضیح کے لیے پیش کرتے ہیں:

۱۔ خود پیغمبرِ اکرم ﷺ سے روایت نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میرے پروردگار نے مجھے لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملائمت کا حکم دیا ہے، جیسے کہ واجبات کی انجام دہی کا حکم دیا ہے۔" (40)

۲۔ انس بن مالک کہتا ہے: "میں نو سال پیغمبرِ خدا ﷺ کی خدمت اور محضر مبارک میں رہا، مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے مجھ سے یہ کہا ہو کہ تم نے فلاں کام کیوں انجام نہیں دیا؟ اور آپؐ نے کبھی بھی مجھے کسی کام پر سرزنش و ملامت نہیں کی۔" (41)

۳۔ جب پیغمبرِ اکرم ﷺ نے مکہ میں اپنی دعوت کو اعلانیہ طور پر شروع کیا تو مشرکین کی جانب سے شدید ردِّ عمل کا سامنا ہوا اور قریش والوں نے کسی قسم کے اذیت و آزار، شکنجوں، جھوٹ اور توہین آمیز سلوک روا رکھنے سے اجتناب نہ کیا اور آپؐ کو جھوٹا، جادوگر اور دیوانہ شخص کہہ کر پکارتے تھے، لیکن پیغمبرِ اکرم ﷺ کا اِن سب کے مقابلے میں ردِّ عمل یہ تھا کہ آپؐ فرماتے تھے: "پروردگارا! میری قوم کو اپنی رحمت و مغفرت کے سائے میں قرار دے کیونکہ وہ حقیقت کو نہیں جانتے۔" (42)

۴۔ سب سے ممتر، پیغمبرِ اکرم ﷺ کا مکہ والوں کے ساتھ کریمانہ اور مشفقانہ رویّہ، فتح مکہ کے موقع پر، وہاں کا سیاسی اقتدار ہاتھ میں لینے کے وقت مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کا ایک نمونہ، اس فتحِ مبین کے دن، کہ جب آنحضرتؐ اپنے وطنِ عزیز سے سالوں دور اور آوارۂ وطن رہنے اور آغازِ بعثت کے ایام میں مشرکینِ قریش کی ناروا تہمتوں، سبّ و شتم اور اذیت و آزار کی تلخ یادوں کے ساتھ، پیروزمندانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے اور ہزاروں کا لشکر آپؐ کے ہمراہ موجود تھا، آپؐ اگر اُس وقت چاہتے تو مشرکینِ مکہ اور قریش والوں سے کئی برابر زیادہ اپنا انتقام لے سکتے تھے اور اپنے لشکر کو قتل و غارت گری کا حکم دے سکتے

تھے؛ لیکن پیغمبرِ اکرم ﷺ نے عام معافی کا حکم صادر فرمایا اور سب کی غلطیوں اور ظلم و ستم کو معاف کر دیا، سوائے اُن چند افراد کے، جنہوں نے اپنی باطنی خباثت اور شدّت پسندی کی وجہ سے بخشش اور معافی کی صلاحیت اور شائستگی اپنے ہاتھ سے دے دی تھی اور وہ کفر و الحاد اور ہٹ دھرمی کا پرچم سر بلند کئے ہوئے تھے۔

سعد بن معاذ جو لشکرِ اسلام کے سپہ سالار تھے، اس موقع پر انہوں نے اس مضمون کی رجز خوانی کی:

"آج قتل و غارت گری اور انتقام لینے کا دن ہے، آج تمہاری جان اور تمہارا مال حلال قرار دیا جائے گا۔"

پیغمبرِ اکرم ﷺ سعد کی یہ گفتگو سن کر بہت ناراحت اور غمگیں ہوئے اور اُن کو سپہ سالاری کے منصب سے برطرف کرکے، پرچم اُن کے بیٹے "قلیل بن سعد" کے سپرد کر دیا اور خود آنحضرتؐ نے اُس دن کی توصیف میں فرمایا: "آج کا دن رحمت و مہربانی کا دن ہے۔" پیغمبرِ اکرم ﷺ نے اس رحمت و مہربانی کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے مکہ والوں سے فرمایا: "جاؤ (آج) تم سب آزاد ہو۔" (43) آنحضرت ﷺ کی اس عفو و درگزر، عطوفت و مہربانی اور وسیع النظری نے مکہ والوں کے دلوں کو موہ لیا اور وہ اسلام اور پیغمبر اکرم ﷺ کی دینداری قبول کرنے کی جانب مائل ہونے لگے۔

۵۔ صفوان بن اُمیہ، جو مشرکینِ مکہ کے سرداروں اور پیغمبر ﷺ کے خلاف متعدّد جنگوں کی آگ بھڑکانے والوں میں سرِ فہرست شمار ہوتا تھا اور اُس نے مسلمانوں میں سے ایک شخص کو مسلمان ہونے کے جرم کی پاداش میں مکہ میں موت کے گھاٹ بھی اُتار دیا تھا، اسی وجہ سے وہ اُن چند لوگوں میں شامل تھا جن کو آنحضرتؐ نے معاف نہیں کیا تھا اور اُن کے خون کو حلال اعلان فرمایا تھا، وہ یہ خبر سن کر مکہ سے جدّہ فرار کر گیا؛ لیکن اس کے چچازاد بھائی "عمرو بن وہب" نے پیغمبر ﷺ کے پاس اُس کی سفارش کی اور اُس کی معافی کا مطالبہ کیا۔

رسولِ خدا ﷺ نے اُسے بھی معاف کر دیا۔ جب اُس کو یہ خبر پہنچی تو اُسے یقین نہیں آیا، یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے اپنا عمامہ یا لباس مبارک معافی کی علامت کے طور پر اس کے لیے بھیجا اور جب اُسے معافی کا یقین آگیا تو وہ مکہ لوٹ آیا۔ اُس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ اُسے دو ماہ کی مہلت دی جائے تاکہ وہ اسلام کے بارے میں تحقیق و جستجو کرے اور اگر نتیجے تک پہنچ گیا تو اسلام قبول کر لے گا۔ پیغمبرِ اکرم ﷺ

نے اُسے چار ماہ کی مہلت دی تا کہ وہ تحقیق کرکے اسلام قبول کرلے۔ صفوان اس واقعے کے بعد کہتا تھا: ''کوئی اس طرح کی نیک سیرت و کردار کا مالک نہیں ہو سکتا، مگر یہ کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہو، میں شہادت دیتا ہوں کہ خدائے یکتا و واحد کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ (محمدؐ) اللہ کے رسول ہیں۔'' (44)

۴۔ شدّت اور صلابت

ا۔۴۔ صلابت کا مفہوم

ابنِ منظور ''لسان العرب'' میں کہتا ہے: ''صَلبَ الشَّیءُ صَلابَۃً فَھُو صَلِیبٌ ... أی شَدِیدٌ'' ''صلابت کسی چیز کے استحکام اور شدّت کے معنی میں ہے۔'''' رَجُلٌ صُلْبٌ وَصَلِبٌ: ذُو صَلابَۃٍ'' (45) ''مردِ صُلب، یعنی صاحب صلابت اور شدّت'' جوہری ''صحاح اللغۃ'' میں ''صَلب'' کو ''سخت زمین'' کے معنی میں سمجھتا ہے۔ (46) اور اسی معنی میں ہے: صُلب (قُفل کے وزن پر)۔

صاحبِ ''قاموس قرآن'' کہتا ہے: ''ھُوَصُلْبٌ فِی دِینِہِ'' (47) ''وہ اپنے دین میں محکم اور استوار ہے۔'' نہج البلاغہ میں امام علی علیہ السلام کے پینتالیسویں (۴۵) خط میں بھی آیا ہے: ''أَلَا وَاِنَّ الشَّجَرَۃَ الْبَرِّیۃَ أَصْلَبُ عَوداً'' ''جان لو! کہ صحرائی درخت (جو طوفانوں کے معرض اور پانی کی کمی سے دُچار ہے) مضبوط اور محکم تر ہے۔'' اِس لفظ کے قرآنی استعمال میں بھی استحکام اور سختی و شدّت کا معنی پوشیدہ ہے۔ اِس آیت مبارکہ: ''خُلِقَ مِنْ ماءٍ دافِقٍ یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرائِبِ'' (48) یعنی: ''وہ ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔'' میں ''صُلب'' کمر کی ریڑھ کی ہڈیوں (مہروں) کے معنی میں ہے، جو مرد کا نطفہ جاری ہونے کا مقام ہے۔ راغب اس نام گذاری کی علّت یہ بیان کرتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈیوں کے مہرے سخت ہوتے ہیں۔ نیز اسی طرح ''صُلب'' کا معنی اور مفہوم اس آیتِ مبارکہ میں ہے: ''۔۔۔ وَحَلائِلُ أَبْنائِکُمُ الَّذِینَ مِنْ أَصْلابِکُمْ۔۔۔'' (49) یعنی: ''اور تمہارے فرزندوں کی بیویاں، جو فرزند تمہاری صُلب (پشت) سے ہیں (تم پر حرام کی گئی ہیں)۔۔۔''

نتیجہ: لفظِ صلابت، استحکام، شدّت، استقامت اور پائیداری کے معنی میں ہے اور اس کے ساتھ کسی چیز، جیسے: دین، عقیدہ، رائے وغیرہ کے اضافہ کرنے سے یہ لفظ اُس چیز کے استحکام اور صلابت و پائیداری کو بیان کرتا ہے، اِس لحاظ سے یہ لفظ منفی اور مذموم معنی کا حامل نہیں ہے؛ بلکہ اکثر موارد میں عمدہ اور

پسندیدہ صفت کے عنوان سے شمار ہوتا ہے، جیسے: ''رَجُلٌ صُلبٌ'' '' استوار اور پائیدار شخص'' یا ''صُلبٌ فی دِینِہِ'' ''وہ اپنے دین اور آئین میں مستحکم اور پائیدار ہے'' یا ''شَجَرَۃٌ صُلبۃٌ'' ''مضبوط اور مستحکم درخت'' جیسا کہ امام علی علیہ السلام اپنے سابقہ خط میں، صحرائی درخت کی پانی کے کنارے موجود درخت پر برتری اور تعریف کرتے ہوئے، صحرائی درخت کو صلابت اور استحکام کے ساتھ سراہتے ہیں؛ جبکہ نہروں اور دریاؤں کے کنارے اُگنے والے درخت اس قدر استحکام و پائیداری اور تعریف کے حامل نہیں ہوتے ہیں۔

۲۔۴۔ صلابت اور غلظت کے مفہوم میں فرق

صلابت اور غلظت دو ایسے الفاظ ہیں، جو مفہوم اور معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے نزدیک ہیں، لیکن معنی کی خصوصیت، کہ جسے ہم نے پہلے صلابت کے مورد میں بیان کیا۔ یعنی تعریفی اور مثبت ہونا۔ کے لحاظ سے صلابت اور غلظت کے درمیان فرق ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ غلظت بھی شدّت اور سختی کے معنی میں ہے: ''غَلَظَ الشَیءُ: اِشْتَدَّ وَقَوِیَ وَصُعبَ'' (50) ''شیء غلیظ ہو گئی، کا معنی یہ ہے کہ مستحکم، قوی اور سخت ہو گئی۔'' اس لحاظ سے غلظت، صلابت کے ہم معنی و مفہوم ہے، لیکن زیادہ تر موارد میں ''غلظت'' منفی معنی کا حامل ہے، جیسے: ''عَذابٌ غَلِیظٌ'' ''یعنی: سخت اور دردناک عذاب'' یا ''۔۔۔ وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۔۔۔'' (51) یعنی: ''اور اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے۔'' یا ''...عَلَیْها مَلائِکَۃٌ غِلاظٌ شِدادٌ...'' (52) یعنی: ''جس (آگ) پر وہ فرشتے معین ہوں گے جو سخت مزاج، تند و تیز اور طاقتور ہیں۔۔۔''

بعض موارد میں غلظت بھی اسی صُلب اور استحکام کے معنی کو ادا کرتا ہے، جیسے: ''... فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوی عَلی سُوقِه...'' (53) یعنی: ''... پھر اسے مضبوط بنائے (اور وہ موٹی ہو جائے اور) پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے...'' یا ''... وَلْیَجِدُوا فِیکُمْ غِلْظَۃً...'' (54) یعنی: ''اور ضروری ہے کہ وہ تم (مومنین) میں سختی اور طاقت کا احساس کریں...''

صلابت اور غلظت کے معانی کے درمیان اسی فرق کا ماحصل یہ ہے کہ لفظِ ''لین'' ''یعنی: نرمی اور خوش خلقی'' غلظت کے مقابل میں قرار پاتا ہے، نہ کہ لفظِ صلابت کے، جیسا کہ سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت

۱۵۹ میں خداوند متعال نے لین یعنی نرم ہونے کو پیغمبرِ اکرم کی صفات میں شمار اور غلیظ و درشت ہونے کو آنحضرتؐ کی جناب سے نفی کیا ہے:

''فَبِما رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔ ۔ ۔''

ترجمہ: ''اے پیغمبر ﷺ! یہ اللہ کی (برکت اور) مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے پراکندہ اور منتشر ہو جاتے۔۔۔''

۳۔۴۔ رسول اعظم ﷺ کی شدّت اور صلابت

اس سے پہلے کہ ہم رسولِ خدا ﷺ کی صلابت اور قاطعیت کے بارے میں گفتگو کریں، چند نکات قابلِ ملاحظہ ہیں:

۱۔ صلابت، شدّت اور سخت گیری کے مفہوم میں، قاطعیت، ثابت قدمی، شدّت پسندی اور تُندروئی کے الفاظ کے ساتھ نزدیک اور ہم معنٰی ہے، اگرچہ براہ راست اور صراحت کے ساتھ ''صلابت'' اور اس کے ہم معانی الفاظ، دینی و قرآنی نصوص و متون میں، اخلاقی، روحانی اور نفسانی صفات کو بیان کرنے کے لیے کم ہی استعمال ہوئے ہیں؛ لیکن دوسری تعبیرات کے انداز میں، جیسے: تُندروئی، شدّت پسندی، قاطعیت اور تسلیم نہ ہونے یا پھر ایسی عبارات اور جملوں کی صورت میں بیان ہوئے ہیں کہ ان کا مضمون اور مفہوم، صلابت اور شدّت کو اوصافِ فضیلت میں سے ایک فضیلت کے عنوان سے بیان کرتا ہے اور اس صفت کو رسولِ خدا ﷺ کے اخلاقی فضائل میں سے قرار دیتا ہے اور تعریف کرتا ہے۔

۲۔ ہر انسان، بالخصوص اجتماعی اور سیاسی پیشواؤں اور رہنماؤں کی زندگی میں، کبھی صلابت و قاطعیت اور شدّت پسندی، نہ صرف یہ کہ شائستہ اور اچھی چیز ہے، بلکہ اس کی ضرورت ناگزیر اور لازمی ہے۔ اگر خطاکاروں، گناہگاروں اور نیز معاشرے یا ایک قلمروئے فکری میں موجود قانون شکن اور جرائم پیشہ افراد کے ساتھ سخت گیری اور قاطعیت وصلابت کا سلوک روا نہ رکھا جائے، تو یہ خطاکار اور جرائم پیشہ افراد، احساسِ اَمنیت کریں گے اور معاشرے کا عمومی ماحول، خوف و وحشت اور ناامنی کا شکار ہو کر سب کے لیے آرام و آسائش سلب ہونے کا موجب بن جائے گا اور گڑبڑ سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، جیسا کہ

بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں سخت اور قاطعانہ رویّہ نہ ہونے کی وجہ سے، استعمار گران اور تجاوز کنندگان، اقتدار و حاکمیتِ ملّی اور نیز استقلال و استحکام مملکت کو اپنے قدموں تلے روند ڈالتے ہیں۔
اسی وجہ سے ہے کہ عقل و خردِ انسانی اور نیز شریعت اسلامی، صلابت اور قاطعیت کو بہت سے موارد میں ضروری، لازم اور جائز شمار کرتی ہیں اور نیز معاشرے کے راہنماؤں اور رہبروں کے لیے صلابت و قاطعیت کے ہونے کو اُن کے اس مقام اور منصب کی شائستگی اور ضروری صلاحیت کے طور پر جانا گیا ہے۔
اس لحاظ سے پیغمبرِ اکرم ﷺ لوگوں کے ساتھ کمالِ رأفت و مہربانی کے مالک ہونے کے باوجود، دشمنانِ اسلام اور مخالفانِ حق کے مقابلے میں شدّت و صلابت، قاطعیت اور سخت برخورد میں بھی کمال رکھتے تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپؐ تمام انسانی کمالات کا نمونہ اور اُسوہ قرار نہ پاتے۔

۳۔ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی شدّت و صلابت اور قاطعیت کی حدود بالکل مشخّص اور معیّن تھیں:

ایک: حدود اور احکامِ الٰہی کے اجراء اور نفاذ کا مقام

دوسرا: کافر اور ہٹ دھرم مشرکین کے ساتھ، کہ جو حق کو، حقیقت سے ناآگاہی اور عدمِ شناخت کی بناء پر نہیں، بلکہ حق و حقیقت سے دشمنی اور عداوت کی بناء پر قبول نہیں کرتے تھے اور نیز منافقین، مجرمین اور گناہگار لوگ، چاہے وہ مسلمانوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوں اور انہوں نے ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اُوڑھا ہوا ہو۔ قرآنی آیات کے چند نمونے، جو رسولِ اعظم اسلام ﷺ کی شدّت و صلابت اور قاطعیت کی بیان کرتی ہیں:

۱۔ ''فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔۔۔'' (55)

ترجمہ: ''پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو کفّار کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور گرفت میں لے لو اور قید کر دو اور ہر راستہ اور گزرگاہ پر ان کے لئے بیٹھ جاؤ اور راستہ تنگ کر دو۔۔۔''

جیسا کہ ظاہر ہے یہ آیتِ مبارکہ، مشرکین کے ساتھ سخت ترین موضع گیری اور قاطعانہ رویّہ اختیار کرنے کا اعلان کرتی ہے، اسی سورہ کی اس آیت سے پچھلی آیات یا قرآنِ کریم کی دوسری سورتوں کی وہ آیات، جو اس موضوع کے ساتھ مربوط ہیں، اگر اُن میں تأمّل اور غور و فکر کیا جائے تو واضح اور مشخّص ہو جاتا ہے کہ

اس طرح کا سخت اور شدید دستور العمل، مسلمانوں اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہم پیمان مشرکین کی پیمان شکنی اور وعدہ خلافی کے بعد دیا گیا ہے۔

علّامہ طباطبائیؒ سورۂ مبارکہ توبہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں، کہ جن میں رسمی اور اعلانیہ طور پر مشرکین سے بیزاری کا اظہار ہوا ہے، فرماتے ہیں: ''ان آیاتِ مبارکہ سے مقصود، اُن مشرکین کے ساتھ اَمن کا معاہدہ ختم ہونے کا اعلان ہے کہ جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تھا (اور بعد میں یہ معاہدہ توڑ ڈالا)، یہ (معاہدہ ختم ہونے کا) اعلان بغیر کسی سبب اور وجہ کے صادر نہیں ہوا، کیونکہ خداوند متعال بعد میں آنے والی متعدّد آیات میں بیان کرتا ہے کہ مشرکین کے اس عہد و پیمان پر ہرگز کوئی اطمینان و اعتماد نہیں ہے، بالخصوص یہ کہ بہت سے مشرکین نے پیمان کی رُو سے روگردانی کی اور انہوں نے پیمان کی حُرمت کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ اگر اس عہد و پیمان کا ایک طرفہ اور وہ بھی مسلمانوں کی وجہ سے باطل کرنا، مشرکین کی طرف سے بغیر کسی تخلّف اور علّت کے ہوتا، تو کوئی دلیل اور وجہ نہیں تھی کہ قرآنِ کریم مشرکین کے دو گروہوں (وہ جو اپنے عہد و پیمان پر وفادار رہے اور وہ جنہوں نے اپنے عہد و پیمان سے روگردانی کی اور پیمان توڑ ڈالا) کے درمیان فرق قرار دیتا اور کہتا: وہ جنہوں نے عہد و پیمان شکنی کی، وہ حکمِ برائت سے مستثنیٰ ہیں:

''إِلَّا الَّذِينَ عاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَداً فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ'' (56)

ترجمہ: ''علاوہ ان افراد کے جن سے تم مسلمانوں نے معاہدہ کر رکھا ہے اور انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور تمہارے خلاف ایک دوسرے کی مدد نہیں کی ہے تو چار مہینے کے بجائے جو مدّت طے کی ہے اس وقت تک عہد کو پورا کرو کہ خدا تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

پس آیتِ مبارکہ کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین کا وہ گروہ، جو مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان رکھتا تھا، یہ آیت اُن کے ساتھ عہد و پیمان کے باطل ہونے اور اَمان کے برطرف ہونے کا اعلان کرتی ہے، کیونکہ اُن میں سے اکثر نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا اور یہی چیز سبب بنی کہ اُن تھوڑے سے لوگوں کی نسبت، جو ابھی تک اپنے عہد و پیمان کے ساتھ وفادار تھے، اعتماد و اطمینان باقی نہ رہے اور اُن کی طرف سے بھی اسلام کے خلاف شرارتوں اور نیرنگ بازیوں سے اَمنیت کا احساس باقی نہ رہ سکے۔'' (57)

۲۔ ''فَلا تُطِعِ الْکافِرِینَ وَجاهِدْهُمْ بِهِ جِهاداً کَبِیراً'' (58)

ترجمہ: ''لہٰذا آپؐ کافروں کے کہنے میں نہ آئیں اور ان سے آخر دم تک جہاد کرتے رہیں۔''

۳۔ ''یا أَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللهَ وَلا تُطِعِ الْکافِرِینَ وَالْمُنافِقِینَ۔۔۔'' (59)

ترجمہ: ''اے پیغمبر ﷺ! خدا سے ڈرتے رہیئے اور خبردار کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے...''

اس آیت مبارکہ میں کافروں اور منافقوں کے مقابلے میں صلابت اور قاطعیت اختیار کرنے کی دعوت سے پہلے، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنے کی ضرورت پر یادآوری، کا معنی یہ ہے کہ قاطعیت اور صلابت بھی تقوائے الٰہی کے مصادیق میں سے ہے۔

۴۔ ''فَلا تُطِعِ الْمُکَذِّبِینَ * وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُونَ * وَلا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَهِینٍ'' (60)

ترجمہ: ''لہٰذا آپؐ جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں، یہ چاہتے ہیں کہ آپؐ ذرا نرم ہو جائیں تو یہ بھی نرم ہو جائیں اور خبردار آپؐ کسی بھی مسلسل قسم کھانے والے ذلیل کی اطاعت نہ کریں۔''

شہید مرتضیٰ مطہریؒ اس آیتِ مبارکہ کے مفہوم اور مقصود کو اس طرح توضیح دیتے ہیں: ''اس آیت کا موضوع ''ادھان'' یعنی تساہُل و تسامُح اختیار کرنا'' ہے اور یہ ''ادھان'' یعنی سہل گیری اور نرم رویّہ اختیار کرنا دو طرفہ ہے؛ تدھن: اپنی گفتگو میں تھوڑا نرمی سے کام لو تاکہ ہم بھی اپنی گفتار میں نرمی لائیں، یعنی تساہُل اور آسان رویّہ اختیار کرنا۔ آجکل ایک اور اصطلاح وجود میں آئی ہے جس کا نام رکھا ہے ''تسامُح'' اگرچہ ''تسامُح'' اپنے معنیٰ کی حد تک اچھی تعبیر ہے لیکن انہوں نے اس کا نام رکھا ہے، تسامُح دینی، تاکہ تساہُل و سہل گیریِ دینی کا تعصّب دینی کے مقابلے میں دفاع کریں،۔۔۔ قرآنِ کریم اس کی شدّت کے ساتھ نفی و تردید فرماتا ہے: ''فَلا تُطِعِ الْمُکَذِّبِینَ۔۔۔'' (61)

پھر شہید مطہریؒ تسامُح کو ممدوح اور مذموم دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان کے فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وہ مطلب جس کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہی مسئلہ تساہُل و تسامُح ہے، کیا قرآنِ کریم اس کام کی بطورِ کلّی نفی کرتا ہے؟ ضروری ہے کہ میں عرض کروں کہ یہاں دو مطلب ہیں: ایک قسم کی قرآنِ کریم بطورِ کلّی نفی کرتا ہے اور پیغمبرِ اکرم ﷺ کو ہرگز اجازت نہیں دیتا، کجا برسد کہ غیرِ پیغمبرؐ ہو، اور وہ (یعنی) آئندہ کے پروگرام اور طرزِ تفکّر کی اساس اور بنیاد پر مصالحت و صلح کرنا، یعنی: آج کل کی

اصطلاح میں آئیڈیالوجی۔ یعنی: آئیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مصالحت اور توافق کریں کہ تم اپنی بعض باتوں سے صرفِ نظر کرو، ہم بھی اپنی بعض باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ ایک دینِ حق، محال ہے اس طرح دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے اور کنارہ گیری اختیار کرنے کی اجازت دے... حتی کہ ایک مستحب یا مکروہ کام بھی مصالحت اور در گزر کے قابل نہیں ہے۔ ایک چیز جو وحیِ الٰہی کا جزء ہے، چاہے معمولی مکروہ کے عنوان سے، مصالحت کے قابل نہیں ہے۔

بلکہ ایک دوسرا امر (کام) ہے جو مصالحت اور در گزر کے قابل ہے اور اصطلاحی طور پر ٹیکنیک اور چارہ جوئی کے قابل ہے۔ مصالحت و صلح، ٹیکنیک کے مسئلہ سے مربوط ہے، اصول کے ساتھ ٹیکنیک اور چارہ جوئی کا مسئلہ، یعنی خود لائحہ عمل (پروگرام) کے مواد اور محتوا میں ہر گز جاری نہیں ہوتا، بلکہ میدانِ عمل میں جاری ہوتا ہے، یعنی کسی کام کے اجراء و نفاذ کے موقع پر یہ معاہدہ کریں کہ اس کام کو فعلاً (وقتی طور پر) مقدّم یا مؤخّر کردیں گے۔۔۔ قرآنِ کریم نے پیغمبرِ اکرم ﷺ سے یہ اختیار سلب نہیں کیا ہے کہ آنحضرتؐ مشرکین کے ساتھ ایک قرار دادِ مصالحت کے اجراء کرنے کے مقام پر امضاء نہ کریں اور نہ ہی اپنے نزاع اور جھگڑوں میں صلح کریں۔" (62)

۵۔ "وَعَلَى الثَّلاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّى إِذا ضاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِما رَحُبَتْ وَضاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لا مَلْجَأَ مِنَ اللهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ"

ترجمہ: "اور اللہ نے اُن تینوں پر بھی رحم کیا جو (جنگِ تبوک میں) جہاد سے پیچھے رہ گئے (اور مسلمانوں نے اُن کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے) یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعتوں سمیت اُن پر تنگ ہو گئی اور اُن کی دَم پر بن گئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب اللہ کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے، تو اللہ نے اُن کی طرف توجہ فرمائی کہ وہ توبہ کرلیں اس لئے کہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔" (63)

یہ آیتِ شریفہ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی اُن تین مسلمانوں کے ساتھ قاطع، شدید اور باصلابت رفتار کی حکایت کرتی ہے کہ جنہوں نے غزوۂ تبوک میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے میں شرکت سے روگردانی اختیار کی۔ جب آنحضرتؐ جنگ کے بعد مدینہ لوٹ کر آئے اور یہ تینوں افراد آپؐ کے حضور شرفیاب ہوئے تاکہ اپنی طرف سے عذر اور بہانہ تراشی کر سکیں تو پیغمبرِ اکرم ﷺ نے اُن سے کوئی کلام نہ کیا اور دوسرے

مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ ان کے ساتھ بات نہ کریں، یہ فرمانِ نبویؐ باعث بنا کہ ان کی بیویاں اور بچّے آنحضرتؐ کے محضر میں آئیں اور ان سے جدائی کا مطالبہ کریں! شہرِ مدینہ کا عمومی ماحول ان تینوں پر اس قدر تنگ و دشوار ہو گیا کہ ناچار انہوں نے مدینہ چھوڑ دیا اور اطراف کے پہاڑوں میں پناہ لے لی۔ ایک طویل مدّت (چالیس سے زائد روز یا ایک قول کے مطابق ایک سال) تک وہ پہاڑوں میں خدا سے راز و نیاز، تضرُّع و زاری اور توبہ و استغفار میں مشغول رہے، یہاں تک کہ خداوند متعال نے ان کی توبہ قبول کی اور یہ آیتِ مبارکہ نازل فرمائی! یہ موقع تھا کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ نے ان کو معاف کر دیا اور وہ اپنے گھروں اور مسلمانوں کی محافل میں داخل ہونے کے قابل ہوئے۔(64)

۶۔ ''مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُم۔۔۔'' (65)

ترجمہ: ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحمدل ہیں۔۔۔''

رحمت اور صلابت و قاطعیت (مومنین کے ساتھ رحمت، رأفت و مہربانی اور کافروں و مشرکوں کے ساتھ صلابت و قاطعیت) کا اکٹھے ذکر کرنا، اس لحاظ سے ہے کہ یہ دونوں فضیلتیں؛ نہ صرف یہ کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی اجتماعی و معاشرتی راہ و رفتار کی عمدہ ترین صفات اور خصلتیں ہیں، بلکہ آپؐ پر ایمان لانے والے آپؐ کے پیروکاروں کے لیے بھی عمدہ ترین اخلاقی و معاشرتی صفات اور نمونۂ عمل کے لیے واضح معیار و میزان ہیں، البتہ اس طرح کی ارزش مندی، رحمت و رأفت کی نسبت ذہن سے قریب تر ہے، لیکن شدّت و صلابت کے بارے میں، اگر قرآنِ کریم کی وحیانی سفارشات نہ ہوتیں، تو کسی قدر عجیب و غیرِ قابلِ قبول لگتیں، جبکہ قرآنِ کریم کی آسمانی والٰہی تعلیمات، پیغمبرِ اکرم ﷺ کی شخصیت کو گویا اس سبب سے خُلقِ عظیم کا مالک سمجھتی ہیں کہ آپؐ رحمت و صلابت کا مکمل پیکر اور نمونۂ عمل ہیں۔ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے، قرآنِ کریم کی اُن وحیانی آیات کا فقط ایک نمونہ ہے جو رسولِ خدا ﷺ کی قاطعیت و صلابت کو بیان کرتی ہیں۔

۴۔۴۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی قاطعیت کے تاریخی نمونے

سیرتِ پیغمبرِ اکرم ﷺ کی تاریخ، جو درحقیقت اُنہی گزشتہ قرآنی تعلیمات کا پیغمبرؐ کے عمل اور راہ و رفتار میں جلوہ نما ہونا ہے، آپؐ کے قاطعانہ اور باصلابت عملی نمونوں کو واضح اور آشکارا کرتی ہے:

۱۔ فاطمہ مخزومی نامی اشرافِ قریش کی ایک عورت جب چوری کی مرتکب ہوئی تو رسولِ خدا ﷺ نے اس کے بارے میں الٰہی حد جاری کرنے کا حکم فرمایا، قبیلۂ بنی مخزوم اس حکم سے ناراحت ہوئے اور انہوں نے کوشش کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اجرائے حد کو روکیں، حتی کہ اُسامہ بن زید نے، جو کہ آنحضرت ﷺ کے نزدیک محبوب اشخاص میں سے تھا، جب آپؐ سے بخشش کا تقاضا کیا، تو آپؐ اس درخواست سے سخت ناراحت ہوئے اور فرمایا: "آیا تم حدودِ الٰہی میں سے ایک حد کے (جاری ہونے کے) بارے میں شفاعت کرتے ہو؟!" پھر آپؐ اپنی مقام سے کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، جس کا کچھ حصّہ یہ تھا:

"اے لوگو! تم سے پہلے والی اُمتّوں کے ہلاک ہونے کہ وجہ یہ تھی کہ اگر اُن میں سے کوئی بلند مرتبہ شخص کسی جُرم کا ارتکاب کرتا تھا تو وہ اس کو مجازات نہیں کرتے تھے لیکن اگر ضعیف و ناتوان اور اجنبی شخص کوئی گناہ کرتا تھا تو اس کے بارے میں حکمِ خدا جاری کرتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر (برفرضِ محال) میری بیٹی فاطمہؑ بھی اس طرح کا کوئی کام کرے تو میں اس کے بارے میں بھی حکمِ خدا جاری کروں گا اور حکم و قانونِ خدا کے سامنے فاطمہ مخزومی اور فاطمہ محمدیؐ یکساں ہیں۔" (66)

احکام اور حدودِ الٰہی کے اجراء میں صلابت و قاطعیت، اس لحاظ سے ضروری، پسندیدہ اور اخلاقی فضیلت کے طور پر شمار ہوتی ہے کہ اس مورد میں سُستی و غفلت، اجتماعی زندگی کی بنیادیں کمزور کرنے، جُرم و جنایات کے بڑھنے، عمومی حُرمت و عفّت کے پائمال ہونے، ارزشمند چیزوں کے بے ارزش ہونے اور اخلاقی و اعتقادی اوصاف کے ناپید و کمیاب ہونے کا باعث بنتی ہے کہ کوئی بھی اندیشمند اور عقلمند اس طرح کی نرمی، مصالحت اور مسالمت کو بعد میں آنے والی ذلّت و نکبت اور رسوائی و خواری کے مقابلے میں قبول نہیں کرتا۔

۲۔ غزوۂ تبوک کے بعد، جو ہجرت کے نویں سال پیش آیا، قبیلۂ ہوازن کے کچھ نمائندہ افراد نے اپنے قبیلے کے اسلام قبول کرنے کے لیے اپنے تمایل کا اظہار کیا اور اس کام کے لیے پہلے کچھ شرطیں معیّن کیں، جن میں سے ایک شرط یہ تھی کہ وہ لوگ (ایک سال تک) نماز پڑھنے سے معاف رہیں گے! لیکن پیغمبرِ اکرم ﷺ نے پوری قاطعیت و صلابت کے ساتھ اس شرط کے مقابلے میں استقامت فرمائی، باوجود اس کے کہ آپؐ کی شدید خواہش تھی کہ ایک ایک فرد ایمان لے آئے۔ کہاں یہ کہ ایک پورا قبیلہ مسلمان ہو جائے۔ آپؐ نے اُن کی اس شرط کو ٹھکرا دیا اور فرمایا: "وہ دین جس میں نماز نہ ہو اُس میں کوئی خیر و بھلائی نہیں ہے۔" (67)

حوالہ جات

1۔ سورۂ جمعہ، آیت ۲

2۔ سورۂ مریم، آیت ۴۱

3۔ سورۂ مریم، آیت ۵۱

4۔ سورۂ مریم، آیت ۵۴

5۔ سورۂ ص، آیت ۴۵

6۔ سورۂ ص، آیت ۴۸

7۔ سورۂ مریم، آیت ۵۶

8۔ سورۂ ص، آیت ۱۷

9۔ سورۂ ص، آیت ۴۱

10۔ سورۂ ممتحنہ، آیت ۴

11۔ سورۂ احزاب، آیت ۲۱

12۔ مغنیہ، محمد الجواد، التفسیر الکاشف، ۱۹۸۱ء، ج ۷، ص ۳۸۷

13۔ زمخشری، محمود الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التأویل، ج ۳، ص ۵۳۱

14۔ سیوطی، عبدالرحمان، الاتقان فی علوم القرآن، تحقیق: ڈاکٹر محمد ابوالفضل ابراہیم، ج ۲، ص ۲۵۶

15۔ سابقہ حوالہ

16۔ زمخشری، تفسیر الکشاف، ج ۴، ص ۵۱۴

17۔ سورۂ اسراء، آیت ۹

18۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹

19۔ لسان العرب، مادہ رحمت۔

20۔ المفردات فی غریب القرآن، مادۂ رحمت

21۔ زمخشری، تفسیر الکشاف، ج ۱، ص ۸

22۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۱۸

23۔الامام علیؑ، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۷
24۔ صحاح اللغہ، مادۂ رأفت
25۔ اقرب الموارد، مادۂ رأفت
26۔ قرشی، سید علی اکبر، قاموس القرآن، مادۂ رأفت
27۔ طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱، ص۱۸
28۔ النھایۃ، مادۂ رأفت
29۔ سورۂ نور، آیت ۲
30۔ سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۷
31۔ صحاح اللغہ، مادۂ عالم
32۔ سعید شرتونی لبنانی، اقرب الموارد، مادۂ عالم
33۔ سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۵
34۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۲
35۔ سورۂ آل عمران، آیت ۴۲
36۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹
37۔ فخر رازی، محمد بن عمر، التفسیر الکبیر، ج۹، ص ۶۲
38۔ طباطبائی، المیزان فی تفسیر القرآن، ج۹، ص ۶۴
39۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۲۸
40۔ الاصول من الکافی، ج۲، ص۱۱۷، حدیث ۴
41۔ طبرسیؒ، مکارم الاخلاق، ص۱۶
42۔ مجلسیؒ، محمد باقر، بحار الانوار، ج۹۸، ص۱۶۷
43۔ ابنِ جریر طبری، محمد، تاریخ طبری، ج۳، ص۵۶؛ سبحانی، جعفر، فروغِ ابدیت، ج۲، ص۳۶۷؛ سیرہ ابنِ ہشام، ج۴، ص۳۷۴
44۔ سابقہ حوالہ جات
45۔ لسان العرب، مادۂ صُلب
46۔ صحاح اللغہ، مادۂ صُلب
47۔ قاموس القرآن، مادۂ صُلب

48۔ سورۂ طارق، آیت ۶-۷
49۔ سورۂ نساء، آیت ۲۳
50۔ قاموس القرآن، مادۂ غلظ
51۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹
52۔ سورۂ تحریم، آیت ۶
53۔ سورۂ فتح، آیت ۲۹
54۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۲۳
55۔ سورۂ توبہ، آیت ۵
56۔ سورۂ توبہ، آیت ۴
57۔ تفسیر المیزان، ج۹، ص ۱۴۷
58۔ سورۂ فرقان، آیت ۵۲
59۔ سورۂ احزاب، آیت ۱
60۔ سورۂ قلم، آیت ۸-۱۰
61۔ مطہری، مرتضٰی، تعلیم وتربیت، ص ۱۶۷
62۔ سابقہ حوالہ
63۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۱۸
64۔ فروغِ ابدیت، ج ۲، ص ۷۹
65۔ سورۂ فتح، آیت ۲۹
66۔ السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام، ج ۴، ص ۸۵
67۔ سابقہ حوالہ

بُرے اخلاق کو اچھے اخلاق میں بدلنے کی دعا

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ مَا یُلْقِی الشَّیْطَانُ فِی رُوعِی مِنَ التَّمَنِّی وَالتَّظَنِّی وَالْحَسَدِ ذِکْراً لِعَظَمَتِكَ وَتَفَکُّراً فِی قُدْرَتِكَ وَتَدْبِیراً عَلَی عَدُوِّكَ وَمَا جْرٰی عَلَی لِسَانِی مِنْ لَفْظَةِ فُحْشٍ وَ ھَجْرٍ وَ شَتْمِ عِرْضٍ وَ شَھادَةِ باطِلٍ وَ اغْتِیابِ مُؤْمِنٍ غائِبٍ وَ سَبِّ حاضِرٍ وَمَا شْبَهَ ذٰلِكَ نُطْقاً بِالْحَمْدِ لَكَ وَغْراقاً فِی الثَّناءِ عَلَیْكَ وَذَھاباً فِی تَمْجِیدِكَ وَشُکْراً لِنِعْمَتِكَ وَاعْتِرافاً بِاحْسانِكَ وَحْصاءً لِمِنَنِكَ۔

ترجمہ: " اے معبود! ایسا کر کہ شیطان میرے دل میں جو جھوٹی آرزوئیں بدگمانیاں اور حسد پیدا کرتا ہے وہ تیری بڑائی کی یاد تیری قدرت میں غور اور تیرے دشمن کے خلاف اقدام کا ذریعہ بن جائیں اور میری زبان پر جو دشنام دگالی آئے یا فضول بات یا بد گوئی یا جھوٹی گواہی یا کسی غیر حاضر مومن کی غیبت یا کسی حاضر کے لیے گالی زبان پر آئے اور ایسی کوئی اور بات کروں تو اس کی بجائے تیری حمد کرنے لگوں تیری تعریف میں مگن ہو جاؤں تیری بزرگی بیان کروں اور نعمتوں پر شکر بجالاؤں تیری مہربانیوں کا اقرار کروں اور تیرے احسان گناؤں۔"

(دعائے مکارم اخلاق سے اقتباس)

واقعہ کربلا اور کوفیوں کے سیاسی و مذہبی رجحانات

سید رمیز الحسن موسوی*

srhm2000@yahoo.com

کلیدی کلمات: امام حسینؑ، اہل کوفہ، مسلم بن عقیل، امیر شام، اُموی مبلغین، ابن زیاد، کوفہ شہر، کوفہ کے شیعہ۔

خلاصہ

واقعہ کربلا میں اہل کوفہ کا کردار بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، جب بھی کسی تجزیہ نگار نے اس دردناک واقعے پر قلم اُٹھایا ہے، اُس نے اہل کوفہ کے کردار کو ضرور پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں افراط و تفریط بھی دیکھنے میں آتی ہے. اہل کوفہ نے خطوط لکھ کر امام حسینؑ کو دعوت ضرور دی تھی۔ لیکن کیا کربلا میں امام کے خلاف لڑنے والے شیعہ تھے ؟ اس تاریخی مغالطے کی تحقیق کے لئے ہمیں ۶۱ ہجری میں کوفہ کے مسلمانوں کے سیاسی ومذہبی رجحانات کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ اُس وقت اہل کوفہ کن حالات سے گذر رہے تھے، اُن کے سیاسی ومذہبی رجحانات کیا تھے اور اُس دور میں شیعہ سے کیا مراد تھی اور شیعہ کی اصطلاح اُس دور میں کن معنوں میں استعمال ہوتی تھی اور پھر بنی اُمیہ نے اہل کوفہ پر تسلط جمانے اور اہل بیت اطہارؑ کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے کیا سیاسی حیلے اور تدابیر اختیار کی تھیں۔ پھر یہ کہ امام حسینؑ کو خط لکھ کر بلانے والے لوگوں میں کتنے لوگ اہل بیت کے اعتقادی شیعہ تھے اور کتنے فقط سیاسی حامی تھے اور وہ فقط اُموی حکومت کے بغض میں امام حسین کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ان میں کتنے لوگ اہل بیتؑ کی اطاعت کو ایک شرعی فریضہ سمجھتے تھے اور اُن کی سیاسی اور اجتماعی نفسیات کیا تھیں ہے۔اس تحریر میں اسی قسم کے چند عناوین کے تحت ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ لہٰذا اس فرق کو سمجھے بغیر واقعہ کربلا کے دوران لشکر عمر سعد میں کوفیوں کی کثرت کو شیعہ سے نسبت دینا محض ایک تاریخی مغالطہ ہے۔ جسے اُموی مبلغین ایک عرصے سے پھیلا رہے ہیں اور عزاداری امام حسینؑ سے عام مسلمانوں کو متنفر کرنے کر سعی کر رہے ہیں تاکہ نواسۂ رسول کے قتل اور خاندان رسولؐ کی بے حرمتی کرنے والے اُموی کرداروں کو چھپا سکیں۔

*۔مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد

مقدّمہ

واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین علیہ السلام کے باب میں اہل کوفہ کا کردار بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، جب بھی کسی مؤرخ اور تجزیہ نگار نے تاریخ اسلام کے اس دردناک واقعے پر قلم اُٹھایا ہے، اُس نے اس واقعہ میں اہل کوفہ کے کردار کو ضرور پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں افراط و تفریط پر مبنی نظریات پیش کئے جاتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی مؤرخ اپنے اعتقادی جذبات سے عاری ہو کر کوئی تجزیہ پیش کر سکا ہو۔ اس سلسلے میں واقعہ کربلا کے بعض تاریک کرداروں کے چہرے پر پردہ ڈالنے اور اس واقعہ کے مجرمین کو بچانے کی خاطر اُموی مشنریوں نے اس دردناک واقعہ کا ذمہ دار اہل کوفہ کو قرار دیا ہے اور اُموی حکومت اور اُس کے ظالم کارندوں کو بری ذمہ قرار دینے کی سعی کی ہے۔

یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ہمارے معاصر اُموی مشنریوں نے بھی اپنی تحریروں میں پورے زور و شور کے ساتھ کوشش کی ہے کہ اس مجرمانہ فعل کی ساری ذمہ داری اُن کوفیوں کے اوپر ڈال دی جائے کہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھ کر کوفہ آنے کی دعوت دی تھی اور پھر امام علیہ السلام کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس قسم کے پروپیگنڈے سے زیادہ تر عوام الناس کو عزائے حسینی کی محافل و مجالس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس عظیم الشان شہادت کے ابدی اثرات کو مٹانے کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے۔

حالانکہ اس دردناک واقعہ سے پوری اُمت متاثر ہوئی ہے اور امام عالی مقامؑ کے بارے میں زبان مبارک رسولؐ سے جاری ہونے والے بے مثال فضائل و مناقب کی وجہ سے پوری اُمت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سے محبت و عشق رکھتی ہے اور سبطین رسول جناب حسنین کریمین علیہما السلام کا غم اور یاد منانا اپنا دینی فریضہ سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمانوں خواہ وہ شیعہ ہوں یا اہل سنت سب ہی نے ایام محرم میں غم حسین علیہ السلام میں مجالس و محافل برپا کی ہیں شیعوں کے علاوہ اہل سنت کی عزاداری کی ایک پوری تاریخ ہے جس پر اس وقت بھی بلاد اسلامی کے مختلف حصوں میں عمل کیا جاتا ہے خصوصاً برصغیر پاک وہند میں اس کی بہت زیادہ مثالیں موجود ہیں۔ لیکن جب سے ناصبیت کو عالمی کفر کی پشت پناہی ملی ہے اور سامراجی قوتوں نے بعض نام نہاد اسلامی فرقوں کی سرپرستی شروع کی ہے، عزاداری امام حسینؑ کے خلاف پروپیگنڈے نے بھی نیا رنگ اختیار کیا ہے اور اُموی کوششوں کو جدید وسائل اور نئے انداز میں پیش کیا جانے لگا ہے۔

اس سلسلے میں ایک عامیانہ پروپیگنڈہ یہ کیا جاتا ہے کہ شیعوں نے خود ہی امام حسین علیہ السلام کو قتل کیا ہے اور اب اس پر گریہ وماتم کررہے ہیں چونکہ امام کو دعوت دینے والے تمام لوگ شیعہ ہی تھے۔اس بارے میں اہل کوفہ کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔اس پروپیگنڈے کا بڑا مقصد اُموی کرداروں کو چھپانا اور یزید کو بری الذمہ قرار دینا ہے۔البتہ یہ مذموم سعی کوئی نئی نہیں ہے بلکہ اُموی حکومت نے بھی جب قتل امام حسینؑ کے بعد اپنا چہرہ رسوا ہوتے دیکھا تو سب سے پہلے خود یزید نے اپنے آپ کو اس جرم سے بری ذمہ قرار دینے کی کوشش کی اور ساری ذمہ داری ابن زیاد پر ڈال دی تھی۔

اس تاریخی مغالطے کی تحقیق کے لئے ہمیں ۶۱ ہجری میں کوفہ کے مسلمانوں کے سیاسی ومذہبی رجحانات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس وقت اہل کوفہ کن حالات سے گذر رہے تھے،اُن کے سیاسی ومذہبی رجحانات کیا تھے اور اُس دور میں شیعہ سے کیا مراد تھی اور شیعہ کی اصطلاح اُس دور میں کن معنوں میں استعمال ہوتی تھی اور پھر بنی اُمیہ نے اہل کوفہ پر تسلط جمانے اور اہل بیت اطہارؑ کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لئے کیا سیاسی حیلے اور تدابیر اختیار کی تھیں۔

پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ امام حسینؑ کو خط لکھ کر بلانے والے لوگوں میں کتنے لوگ اہل بیت اطہارؑ کے اعتقادی شیعہ تھے اور کتنے فقط سیاسی حامی تھے اور وہ فقط بغض معاویہ میں امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دینا چاہتے تھے اور اُنہیں امام عالی مقام کے خاندان اور دینی حیثیت اور مقام ومرتبے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ان میں کتنے لوگ امام علیؑ اور امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ کی اطاعت کو ایک شرعی فریضہ سمجھتے تھے اور کتنے محض سیاسی مقاصد کی خاطر امام کو کوفہ بلا رہے تھے اور اُن کی سیاسی اور اجتماعی نفسیات کیا تھیں۔ان سب باتوں کے مطالعے کے بعد ہی اس تاریخی مغالطے کی حقیقت روشن ہو سکتی ہے۔اس تحریر میں اسی قسم کے چند عناوین کے تحت ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے:

ا۔ کوفہ کی آبادی

کوفہ شہر کی بنیاد ۱۷ ہجری میں فتح قادسیہ کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر کے حکم سے حضرت سعد بن ابی وقاص کے ذریعے رکھی گئی تھی۔کوفہ کی بنیاد رکھنے کا سب سے بڑا مقصد اس علاقے میں ایک فوجی چھاونی قائم کرنا تھی تاکہ مملکت ایران کے اندر ہونے والی اسلامی فتوحات کو بہتر طور پر انجام دیا

جاسکے۔(1) حضرت عمر نے حکم دیا تھا کہ اس شہر کی مسجد اتنی بڑی ہونی چاہیے کہ تمام مجاہدین اس میں جمع ہو سکیں لہٰذا اس وقت اس مسجد میں چالیس ہزار افراد کی گنجائش تھی۔(2)

اس تاریخی حوالے سے ہم یہ نتیجہ لے سکتے ہیں کہ کوفہ شہر میں آغاز ہی سے چالیس ہزار کے قریب فوجی اور جنگجو موجود تھے اور یقیناًان جنگجوؤں میں سے بہت سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہ رہے ہونگے۔ لہٰذا احتمال ہے کہ اس زمانے میں اس شہر کی آبادی تقریباً ایک لاکھ افراد پر مشتمل ہو گی جو ایک معقول آبادی سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن طبری نے بائیسویں ہجری کے واقعات کے تحت لکھا ہے:

''واختطت الکوفۃ حین اختطت علی ماۃ الف مقاتل''یعنی کوفہ شہر اپنے آغاز سے ہی ایک لاکھ جنگجوؤں کے لئے بنایا گیا ہے۔(3)

اگر ہم طبری کی اس روایت کو قبول کریں تو اُس وقت کوفہ کی آبادی دو لاکھ سے زیادہ ہونی چاہیے لیکن یہ اس شہر میں بنائی گئی مسجد کی گنجائش سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اگر طبری کی اس عبارت میں ایک لاکھ سے مراد ہم جنگجو نہ لیں بلکہ افراد لیں تو پھر یہ روایت قابل قبول ہو سکتی ہے چونکہ اگر جنگجو اور مجاہد مراد تو پھر ہر جنگجو کے ساتھ اُس کے خاندان کے چند افراد بھی ہونے چاہیں۔

کوفہ کی بنیاد پڑنے کے بعد اس شہر کی طرف پوری اسلامی مملکت سے ہجرت کرنے والوں میں اضافہ ہونے لگا تھا چونکہ ایک تو یہ شہر دریائے فرات کے نزدیک تھا جس کی وجہ سے اس کی آب وہوا بہت خوشگوار تھی۔ دوسرا ایران کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کی اقتصادی اور معاشی صورت حال بھی بہت بہتر تھی اور پھر مسلمان مجاہدین کے ذریعے فتح ہونے والے علاقوں کا مال غنیمت اور خراج بھی اس شہر کی اقتصادی رونق کا سبب بن چکا تھا جس کی وجہ سے عام لوگوں کا رجحان اس شہر کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

اس شہر کی طرف لوگوں کی ہجرت کا سلسلہ ۳۶ ہجری میں اور بھی زیادہ ہو گیا تھا چونکہ حضرت علی علیہ السلام نے اس شہر کو اپنا دارالخلافہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے جب ۳۷ ہجری میں جنگ صفین کا واقعہ پیش آیا تو اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ۶۵ ہزار افراد سے زیادہ ذکر کی گئی ہے۔(4) اگر ان کے ساتھ ان کے خاندانوں کا بھی حساب لگایا جائے تو یہ تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار کو پہنچتی ہے۔ ۴۰ ہجری میں امام

حسن علیہ السلام کی صلح کے واقعہ کے بعد امام علیہ السلام کے بعض اصحاب کی طرف سے اعتراض کے طور پر ایک لاکھ کوفی سپاہیوں کی دلیل بھی پیش کی گئی تھی۔(5)

اسی طرح ۵۰ ہجری میں جب امیر شام کی طرف سے ''زیادابن ابیہ'' کو کوفہ کی امارت سونپی گئی تو سیاسی حکمت عملی کے طور پر کوفہ میں حضرت علیؑ کے حامیوں کی تعداد کو کم کرنے کے لئے بہت زیادہ لوگوں کو کوفہ سے شام، خراسان اور دوسرے علاقوں کی طرف منتقل کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ۵۰ ہزار افراد کو فقط خراسان منتقل کیا گیا تھا۔(6) اس طرح کوفہ کی آبادی کم ہو کر ایک لاکھ چالیس ہزار افراد تک پہنچ گئی تھی جو ۶۰ ہزار جنگجوؤں اور ۸۰ ہزار اُن کے اہل خانہ پر مشتمل تھی یہاں تک کہ جب زیاد نے مسجد کوفہ کی توسیع کی تو اس میں ۶۰ ہزار افراد کی گنجائش رکھی گئی۔(7)

امیر شام کی موت کے بعد ۶۰ ہجری میں بعض کوفیوں نے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھے تو ان میں ایک لاکھ سپاہ کا تذکرہ کیا جو خدمت کے لئے آمادہ تھے۔(8) اگرچہ یہ بات کوفیوں کی جنگی آمادگی کو دیکھا جائے تو مبالغہ آمیز نظر آتی ہے لیکن اس سے امام حسین علیہ السلام کی تحریک کے دوران کوفہ کی آبادی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

درج بالا تاریخی معلومات سے امام حسین علیہ السلام کی تحریک میں کوفیوں کے کردار کے بارے میں یہ نتیجہ لیا جاسکتا ہے:

پہلی بات تو یہ کہ امام حسین علیہ السلام کو لکھے جانے والے خطوط کی تعداد ۱۲ ہزار (9) ذکر کرنا اگرچہ بہت زیادہ نظر آتی ہے لیکن کوفہ کی جو آبادی ذکر کی گئی ہے اس کی نسبت یہ تعداد نصف سے بھی کم ہے۔ اگر یہ قبول بھی کرلیں کہ ان خطوط میں سے بعض خط چند لوگوں یا ایک گروہ کی طرف سے لکھے گئے تھے پھر بھی امام حسین علیہ السلام نے ان خطوط میں دی گئی دعوت پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید معلومات کے لئے اپنے نمائندے حضرت مسلم ابن عقیلؑ کو کوفہ بھیجا۔

دوسری بات یہ کہ حضرت مسلم ابن عقیلؑ کی بیعت کرنے والوں کی تعداد ۱۲ ہزار سے لے کر ۴۰ ہزار تک ذکر کی گئی ہے۔(10) لیکن امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک حدیث کے مطابق ۲۰ ہزار بیعت کرنے والے تھے۔(11) اگر اس تعداد کو قبول بھی کرلیں تو یہ لوگ کوفہ کی کل سپاہ کا پانچواں حصہ بنتے ہیں جس سے حضرت مسلم بن عقیلؑ کی طرف سے حکومت کے خلاف کوئی بڑا اقدام نہ کرنے کا سبب بھی

واضح ہو جاتا ہے۔آخر حضرت مسلمؑ کوفہ کے ایک لاکھ سپاہیوں میں سے ۲۰ہزار سپاہ پر کس طرح بھروسہ کر سکتے تھے ؟

البتہ یہ بھی واضح ہے کہ اگر حضرت مسلم بن عقیلؑ شام کی نمائندہ حکومت کے خلاف کوئی بڑا قدم اُٹھا بھی لیتے اور حکومت بنانے کی کوشش کرتے تو شاید بہت سے غیر جانبدار اور اُموی حکومت کے مخالف لوگ اس نئی حکومت کے ساتھ ہو جاتے۔

تیسری اہم بات یہ کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت کے مطابق عمر ابن سعد کے لشکر کی تعداد ۳۰ ہزار تھی۔(12) جوایک معقول تعداد نظر آتی ہے لیکن یہ تعداد بھی کوفہ کی نصف آبادی کے بھی برابر نہیں تھی۔اس کے مقابلے میں مختار ثقفی کے سپاہیوں کی تعداد ۶۰ ہزار نقل کی گئی ہے چونکہ اُس کے سپاہی ایسے افراد پر مشتمل تھے جو کسی بھی صورت لشکر عمر ابن سعد میں شامل نہیں تھے۔چونکہ مختار کا لشکر قاتلان امام حسینؑ اور واقعہ کربلاکے اشقیا سے انتقام لینے کے لئے تشکیل دیا گیا تھا اور جو انہی لوگوں کی تلاش میں تھا جنہوں نے کربلا میں خاندان رسولؐ کے خلاف جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔لہٰذا اس لشکر میں قاتلین امام حسینؑ شامل نہیں ہو سکتے تھے۔

۲۔اہل کوفہ کی نظریاتی اور نسلی اعتبار سے تقسیم

واقعہ کربلاکے دوران کوفہ کے لوگوں کو ہم نظریاتی اور نسلی اعتبار سے بھی تقسیم کر سکتے ہیں جس سے لشکر عمر ابن سعد میں کوفیوں کی موجودگی کے اسباب کو واضح کرنے میں بہت حد تک مدد مل سکتی ہے۔

ا۔کوفہ میں بسنے والوں کی نسلی اعتبار سے حیثیت

اس دور میں ہم کوفہ کے لوگوں کو دو حصوں میں دیکھتے ہیں: ایک عرب اور دوسرے غیر عرب۔کوفہ میں ساکن عرب بعض ایسے قبائل پر مشتمل تھے جو ایران میں فتوحات کے ساتھ ہی دور دراز عرب علاقوں سے نکل کر جنگ میں شرکت کی نیت سے عراق میں آبسے تھے اور فتوحات کے بعد اُنہوں نے کوفہ اور بصرہ کو اپنا مستقل مسکن بنالیا تھا۔کوفہ میں سکونت اختیار کرنے والے یہ عرب کوفہ کی اہم آبادی شمار ہوتے تھے اور ان کا تعلق نسلی اعتبار سے قحطانی اور عدنانی قبیلوں سے تھا۔جنہیں اصطلاحاً یمانی اور نزاری کہا جاتا تھا۔جب کوفہ کی بنیاد رکھی گئی تھی تو اس وقت کوفہ میں ۱۲ہزار گھر یمانی عربوں کے اور ۸ ہزار گھر نزاری عربوں کے تھے۔(13)

شروع شروع میں یمانی قبائل اہل بیت رسول علیہم السلام کے ساتھ بہت زیادہ اظہار محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں امیر شام نے ان کو اہل بیت اظہارؑ سے دور کرنے کے لئے بہت زیادہ سرمایہ کاری کی اور اُنہیں اپنے نزدیک کرلیا تھا۔(14)

عربوں کا ایک اور حصہ ''بنی تغلب'' قبائل پر مشتمل تھا جو ظہور اسلام سے پہلے ہی عراق میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے اور ہمیشہ ایرانیوں کے ساتھ جنگ وجدال کرتے رہتے تھے۔اسلامی فتوحات کے بعد یہ قبیلے بھی مسلمانوں کے ساتھ آملے تھے اور اُن کی فتوحات میں مدد کرنے لگے تھے اور پھر اُن میں سے بہت سے لوگ کوفہ جیسے جدید اسلامی شہروں میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

کوفہ کے غیر عرب عوام کا تعلق موالی ،سریانی اور نبطی گروہوں سے تھا۔(15) موالی اُن لوگوں کو کہا جاتا تھا جو مختلف عرب قبیلوں کے ساتھ عہد وپیمان باندھ کر اصطلاحاً اُن کی ''ولاء'' کو قبول کرلیتے تھے جس کے بعد حقوق کے لحاظ سے اُنہی قبائل جیسے ہو جاتے تھے۔یہ موالی مختلف نسلوں سے ہوتے تھے ان میں ایرانی،ترک اور رومی نسلیں بھی تھیں جو عرب قبائل کے ہم پیمان بن کر زندگی گزارتے تھے۔ایسے لوگوں کو عرب ''عجم'' کہتے تھے۔

کوفہ میں موالیوں کا سب سے بڑا گروہ ایرانیوں پر مشتمل تھا جنہیں ''حمراء دیلم'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا یہ گروہ ۴ ہزار افراد پر مشتمل ایک سپاہ رکھتا تھا جس کی قیادت ''دیلم'' نامی شخص کررہا تھا۔یہ لوگ سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں اسلامی فوج میں شامل ہوگئے تھے اور اُس کے ساتھ تعاون کا معاہدہ کئے ہوئے تھے۔(16) یہ گروہ بعد میں کوفہ میں سکونت پذیر ہوگیا تھا اور بہت سے ہنر اور فن جانتا تھا لہٰذا کوفہ کے اکثر ہنرمند انہی لوگوں میں سے تھے۔

کوفہ میں موالیوں کی آبادی عربوں سے کہیں زیادہ تھی۔امیر شام ان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے پریشان تھا اور اُس نے اپنے گورنر زیاد کو حکم دے دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کوفہ سے نکال کر شام، مصر اور ایران کے بعض علاقوں کی طرف بھیج دے۔(17)

''سریانی'' اُن لوگوں کو کہا جاتا تھا جو فتوحات سے پہلے حیرہ کے ارد گرد موجود عبادت گاہوں میں رہتے تھے اور عیسائیت کو قبول کرچکے تھے جبکہ نبطیوں سے مراد وہ عرب تھے جو فتوحات سے پہلے عراق کے گوشہ

وکنار میں زندگی گزار رہے تھے اور کوفہ شہر آباد ہونے کے بعد یہ لوگ بھی کوفہ میں آبسے تھے اور زراعت کا پیشہ اپنالیا تھا۔(18) لہٰذا یہ دونوں گروہ بھی کوفہ کی آبادی میں شامل تھے۔

۲۔ کوفہ کی نظریاتی تقسیم

یہاں نظریاتی تقسیم سے ہماری مراد نہ فقط مذہبی عقائد ہیں بلکہ سیاسی رجحانات بھی ہیں۔یعنی کوفہ کے رہنے والے سیاسی ومذہبی نظریات کے حوالے سے کتنے حصوں میں تقسیم تھے۔پھر نظریاتی لحاظ سے اہل کوفہ مسلمان اور غیر مسلمان آبادی پر مشتمل تھے۔کوفہ کے غیر مسلم حصے میں عربوں کے قبیلہ بنی تغلب سے نجرانی اور نبطی عیسائی شامل تھے جبکہ خلافت دوم میں جزیرہ نمائے عرب سے سے نکالے گئے بعض یہودی اور مجوسی بھی کوفہ میں رہتے تھے۔البتہ یہ کوفہ کی کل آبادی کا ایک معمولی سا حصہ تھے۔

کوفہ کے مسلمانوں میں سب سے اہم حضرت علی علیہ السلام کے پیروکار تھے جو شیعیان علیؑ کے نام سے مشہور تھے۔اسی طرح بنی اُمیہ کے طرف داروں کی بھی ایک بڑی تعداد کوفہ میں موجود تھی جو شیعیان عثمان یا عثمانیہ کہلاتے تھے۔ان دو بڑے مسلمان گروہوں کے علاوہ بہت سے خوارج اور کچھ غیر جانبدار لوگ بھی تھے جو جس طرف ہوا کا رُخ دیکھتے اُسی طرف ہو جاتے تھے۔

کوفہ کے شیعہ

اہل بیت اطہارؑ کے شیعوں کو بھی ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جن میں ایک تو شیعہ زعماء اور سردار تھے اور دوسرے عام لوگ تھے۔شیعہ زعما اور سرادروں میں سلیمان بن صرد خزاعی، مسیب بن نجبہ فرازی، مسلم بن عوسجہ، حبیب بن مظاہر اسدی، ابو ثمامہ صائدی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے کہ جو جنگ صفین اور دوسری جنگوں میں حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ تھے۔یہ لوگ خاندان رسولؐ سے گہرا عشق ومحبت رکھتے تھے۔لیکن خاندان عصمت وطہارت کی امامت وولایت پر ایمان کے لحاظ سے ان بھی فرق تھا بعض تو قوی ایمان تھے اور یقین کی منزل پر فائز تھے اور بعض ایسے نہیں تھے۔انہی میں سے بعض لوگوں نے امیر شام کی موت کے بعد امام حسین علیہ السلام کو خطوط بھی لکھے تھے۔

ان شیعہ زعما کے علاوہ شیعہ کے نام سے مشہور عوامی طبقہ وہ تھا جو فقط سیاسی لحاظ سے خاندان نبوتؐ کے حامی تھے لیکن نظریاتی لحاظ سے وہ شیعہ نہیں تھے بلکہ اکثریتی اور حکومتی نظریات کے حامل تھے، یہ لوگ بنی اُمیہ کی ظالمانہ روش حکومت کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کی عادلانہ سیاست کی حمایت کرتے تھے،

جس کی وجہ سے انہیں بھی شیعہ علیؑ کہا جاتا تھا۔ ہم نے نور معرفت کے شمارہ ۲۴، ۲۳ میں شیعہ کے لغوی واصطلاحی معنی کی وضاحت میں شیعوں کی اس تقسیم کی وضاحت کی ہے۔

لہٰذا کوفہ میں شیعہ تھے لیکن نظریاتی شیعہ جو امامت اہل بیتؑ کے معتقد ہوں، بہت کم تھے اور چیدہ چیدہ لوگ ہی معرفت اہل بیت کے اس مرتبے پر فائز تھے۔ واقعہ کربلا نے ایسے شیعوں کو چھلنی سے گزار کر الگ کر دیا تھا جو امام وقت کی اطاعت کو فرض سمجھتے تھے اور امام وقت پر جان نثار کرنا اپنا شرعی فریضہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا کوفہ کے عام شیعوں کو آج کی اصطلاح میں شیعہ اثنا عشری نہیں کہا جاسکتا جو عقیدہ امامت کی وجہ سے دوسرے مسلمان فرقوں سے ممتاز ہیں۔ پھر ایمان کے درجات میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی نظریاتی لحاظ سے شیعہ ہو لیکن امتحان کے وقت سیاسی شیعہ بھی نہ رہے۔ لہٰذا ہمیں واقعہ کربلا میں کوفیوں کے کردار کا تجزیہ و تحلیل کرتے وقت اس چیز کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے سات ذی الحجہ ۶۰ ہجری کی شام کو مسلم بن عقیلؑ بقول تاریخ ۱۸ ہزار بیعت کرنے والوں کے باوجود کوفہ کی گلیوں میں تن تنہا رہ جاتے ہیں۔ مسلم کی تنہائی کے بہت سے اسباب ہیں لیکن ابن زیاد کی سخت حکمت عملی اور لالچ وخوفزدہ کرنے کی پالیسی کی وجہ سے جب بہت سے لوگ مسلم بن عقیل کی کامیابی سے مایوس ہو گئے تو اُنہوں نے ایک دم ہوا کے رخ پر چلنا شروع کر دیا اور امام حسین علیہ السلام کے نمائندے کو تنہا چھوڑ دیا تھا، چونکہ ان میں اکثریت سیاسی شیعوں کی تھی جو سیاسی نشیب وفراز کے تابع تھی۔ یہ لوگ سیاسی تبدیلی کے خواہاں تھے، جس کے لئے ان کے نزدیک بنی اُمیہ کی بیس سالہ حکومت اور امیر شام کی موت کے بعد بہترین انتخاب امام حسین علیہ السلام ہی تھے جو بنی اُمیہ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکتے تھے اور حکومت علوی کو دوبارہ زندہ کرنے کے اہل تھے۔

لیکن یہ ایسے امام حسینؑ کے خواہاں تھے جو کوفہ میں آکر حکومت بنائیں اور بغیر کسی خون خرابے کے تخت خلافت پر بیٹھ جائیں نہ وہ امام حسینؑ جو قربانیاں طلب کریں اور جن کی حکومت کی خاطر کوفیوں کو اپنا خون دینا پڑے۔ عام کوفیوں کی یہ حالت تھی، وہ حلوا کھانا چاہتے تھے لیکن بغیر کسی زحمت کے۔ یہ ایسا طبقہ تھا جس نے جونہی ابن زیاد کے سکوں اور تلواروں کی چمک دیکھی اُس کی طرف ہو گئے اور امام علیہ السلام کے نمائندے کو تنہا چھوڑ دیا۔ عوام کی یہ روش فقط کوفہ والوں سے ہی مختص نہیں ہے بلکہ آج بھی یہی صورت ہے جہاں زر اور زور دیکھا جاتا ہے عوام کی اکثریت کے ووٹ اُسی طرف ہوتے ہیں۔ عوام تو عوام

خواص بھی اپنا قبلہ تبدیل کر دیتے ہیں۔اس موقع پر فقط نظریاتی اور اعتقادی لحاظ سے مضبوط لوگ ہی اپنی جان کی بازی لگانے پر تیار ہو جاتے۔ کوفیوں کی نفسیات کہ جس کو ہم آگے چل کر ذکر کرنے والے ہیں، کا تقاضا یہی تھا جو اُنہوں نے مسلم بن عقیلؑ کے ساتھ کیا تھا۔

کوفہ میں موجود بنی اُمیہ کے یہ سیاسی مخالفین کہ جو شیعہ کے نام سے مشہور ہو چکے تھے اور بقول فرزدق جن کے دل تو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تھے لیکن تلواریں اُموی گورنر ابن زیاد کے تابع تھیں۔ جنہوں نے جب امیر شام کی موت کی خبر سنی تو اُن کے دلوں میں بنی اُمیہ کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کی اُمید پیدا ہو گئی اور مستقبل میں اُنہیں اس سے چھٹکارے کا واحد راستہ امام حسینؑ ہی کی حکومت میں نظر آیا لہٰذا جہاں حبیب ابن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ جیسے اہل بیت اطہارؑ کے مخلص شیعوں نے امام علیہ السلام کو کوفہ آنے کے لئے خطوط لکھے وہاں بنی اُمیہ کی حکومت کے سیاسی مخالفین نے بھی امامؑ عالی مقام کو خطوط لکھنے شروع کر دیے۔

جو بادی النظر میں شیعہ ہی سمجھے جاتے تھے لیکن مذہبی اعتقاد کے لحاظ سے وہ بنی اُمیہ کے حامیوں جیسے ہی تھے ۔ لیکن امام حسین علیہ السلام اپنی الٰہی بصیرت سے جانتے تھے کہ ان خطوط میں کتنی سچائی ہے یہی وجہ ہے کہ امامؑ نے اہل کوفہ کو اخلاص کی چھلنی سے نکالنے کے لئے پہلے اپنے نمائندے مسلم بن عقیلؑ کو اہل کوفہ کی طرف بھیجا تاکہ اُن کی طرف سے حجت باقی نہ رہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس قسم کے لوگوں کا امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھنا اُن کے شیعہ ہونے کی دلیل نہیں چونکہ ان خطوط کا مقصد سیاسی تھا نہ اعتقادی۔ لہٰذا ان کا اہل بیتؑ کے بعض مخلص شیعوں کے ہمراہ خطوط لکھنے کی تحریک میں شامل ہونا انہیں شیعہ ظاہر کرنے کے لئے کوئی قانع کنندہ دلیل نہیں ہے۔

دوسری جانب کوفہ کے ان سیاسی شیعوں کو معلوم نہیں تھا، بنی اُمیہ کی پھیلائی ہوئی تاریکی سے نکلنے کے لئے فقط نواسۂ رسول کو خطوط لکھ کر دعوت دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے امتحان بھی دنیا ضروری ہے۔چونکہ امیر شام نے اُمت مسلمہ پر بنی اُمیہ کے تسلط کو اپنے بیس سالہ مطلق العنان دور حکمرانی میں اتنا مضبوط کر دیا تھا اور اس کو دوام بخشنے کے لئے ایسے اصول وضوابط بنا دیئے تھے کہ جن کو توڑنا کوفہ کے خوش فہم مسلمانوں کے بس سے باہر تھا۔

جب یزید کو پتا چلا کہ کوفہ میں مخلص شیعہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھ کر بلا رہے ہیں تو اس نے اپنے خاص عیسائی غلام سرجون کو بلایا اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ یہ وہ سرجون ہے جو امیر شام کا خاص مشیر تھا۔ اس عیسائی مشاور نے یزید کے سامنے اُس کے والد معاویہ کا خط پیش کیا کہ اگر کوفہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہو تو وہاں عبید اللہ ابن زیاد کو مسلط کر دینا۔ لہٰذا یزید نے اسی عیسائی مشاور کے کہنے پر ابن زیاد کو جو اس وقت بصرہ کا گورنر تھا خط لکھا کہ:

"أما بعد فانه كتب الى شيعتى من أهل الكوفة يخبروننى أن ابن عقيل بالكوفة يجمع الجموع لشق عصا المسلمين فسر حين تقرأ كتابي هذا حتى تأتي أهل الكوفة فتطلب ابن عقيل كطلب الخرزة حتى تثقفه فتوثقه أو تقتله أو تنفيه والسلام۔" (19)

"اما بعد! کوفہ سے میرے پیروؤں نے خط لکھ کر مجھ کو خبر دی ہے کہ ابن عقیل کوفہ میں جمع ہو کر مسلمانوں کے اجتماع کو درہم برہم کر رہا ہے تو تم میرا خط پڑھتے ہی کوفہ پہنچ جاؤ اور ابن عقیل کا پیچھا کرو جیسے کوئی اپنے گم شدہ گوہر کو تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اسے اپنی گرفت میں قید کر لو یا قتل کر دو یا پھانسی پر چڑھا دو۔ والسلام۔"

لہٰذا ابن زیاد نے کوفہ پر مسلط ہونے کے بعد مسلم بن عقیل علیہ السلام کے ارد گرد سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے ایسی خاص تدابیر اختیار کیں جو اُسی کا خاصہ تھیں اور کوئی دوسرا حکمران ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لالچ اور خوفزدہ کرنے کے ایسے طریقے اپنائے کہ جن کے آگے کمزور ایمان کوفیوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ امام حسین علیہ السلام کو لکھے گئے خطوط کو بھول گئے فقط وہی لوگ باقی رہ گئے تھے جو اطاعت امام کے مفہوم سے آگاہ تھے اور ابن زیاد کے کسی بھی حربے کے آگے تسلیم نہیں ہونے والے تھے، ان سب کو ابن زیاد جانتا تھا جن میں ہانی بن عروہ، میثم تمار اور مختار ثقفی جیسے افراد تھے لہٰذا ان شیعہ خواص کو امام حسینؑ کی نصرت سے باز رکھنے کے لئے ابن زیاد نے پہلے ہی سے دوسرے ظالمانہ حربے اختیار کر لئے تھے۔ میثم تمار اور مختار کو زندان کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا اور ہانی بن عروہ کو مسلم بن عقیل علیہ السلام کے ساتھ ہی ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہوئے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

البتہ انہی میں سے بہت سے کوفیوں نے بعد میں توابین کی تحریک اور قیام مختار ثقفی میں حصہ لیا تھا لیکن تاریخ سے واضح نہیں ہوتا کہ ان میں کتنے لوگ لشکر عمر سعد میں شریک ہوئے تھے اور امام حسین علیہ السلام

کے خلاف لڑے تھے۔ لیکن تاریخ سے یہ واضح ہے کہ ابن زیاد نے امام حسین علیہ السلام کی نصرت کو روکنے کے لئے ہر حیلے اور حربے سے کام لیا تھا، لوگوں میں مال ودولت تقسیم کرنے، زندان کو مخالفین سے بھرنے، خوف وہراس اور قتل وغارت کرنے سے لے کر کوفہ شہر کے تمام دروازوں تک کو اس طرح بند کر دیا گیا تھا کہ وہاں سے پرندہ بھی نہیں گذر سکتا تھا۔

ایسے حالات میں امام حسینؑ پر جان نثار کرنے کی آرزو رکھنے والے کس طرح کربلا پہنچ سکتے تھے۔ لہٰذا یہ بہت بعید ہے کہ کوفہ میں موجود اُموی مخالفین اور بظاہر اہل بیتؑ کے شیعہ، لشکر عمر سعد میں شریک ہوئے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُموی کارندوں نے کوفیوں ہی سے لشکر ترتیب دیا تھا لیکن اس لشکر میں وہی لوگ شامل تھے جو بظاہر غیر جانبدار تھے یا اُموی حکومت کے ہمدرد تھے اور ان میں سے بعض لوگ ابن الوقتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھنے کی تحریک میں بھی شامل ہو گئے تھے جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

لیکن یہ واضح رہے کہ توابین کی تحریک میں وہی لوگ شامل تھے جو کسی نہ کسی طرح امام علیہ السلام کی مدد ونصرت کرنے سے رہ گئے تھے، اب یہ اُن کی اہل کوفہ کی عادت ونفسیات کے مطابق سستی یا کوتاہی تھی یا ایمان کی کمزوری یا حکومت ابن زیاد کی طرف سے سخت حالات تھے جن کی وجہ سے وہ کربلا میں امام حسینؑ کے جان نثاروں میں شریک نہیں ہوسکے تھے۔ لہٰذا وہ اسی کوتاہی اور عدم نصرت پر پشیمان ضرور تھے جس کا اظہار اُنہوں نے بنی اُمیہ کی حکومت کے خلاف قیام کی صورت میں کیا تھا اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔ البتہ قیام توابین کی تفصیل ذکر کرنے کے لئے ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے۔

کوفہ میں بنی اُمیہ کے حامی

دوسری طرف کوفہ میں شیعوں کے علاوہ ایک بڑی تعداد حکومت شام کے حامیوں کی موجود تھی جو یا تو امیر شام کے نظریاتی حامی تھے یا اُس کی طرف سے ملنے والے مادی انعام واکرام اور پیسے کی ریل پیل کے عادی تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی حکومت کے دوران بھی مختلف فتنوں کا سبب بنے رہے تھے اور گاہے بگاہے علی علیہ السلام کے لئے مشکلات کھڑی کرتے رہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی ذمہ داری حکومت شام کو عراق بالخصوص کوفہ کے حالات سے باخبر رکھنا تھا۔

امیر شام نے امام علی علیہ السلام کی شہادت اور صلح امام حسنؑ کے بعد پورے عالم اسلام پر تسلط حاصل کرنے کے بعد کوفہ میں موجود اپنے ان حامیوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔لہٰذا یہ لوگ امیر شام کی بیس سالہ حکومت کے دوران حکومت شام سے مسلسل رابطے میں تھے اور آئندہ کی اُموی سلطنت کے دوام کے لئے کوفہ کے لوگوں پر کام کر رہے تھے۔

تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ جب امیر شام کی موت کے بعد بعض کوفی شیعوں کی طرف سے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھے جانے لگے تو انہی اُموی جاسوسوں نے حکومت شام کو کوفہ کے حالات سے آگاہ کرنے اور کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کی کمزور سیاست سے آگاہ کرنے کے لئے شام کی طرف اپنے خطوط بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔یزید انہی لوگوں کے خطوط کے ذریعے کوفہ میں مسلم بن عقیلؑ کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوا تھا اور پھر اُس نے اپنے باپ کے راز دار غلام سرجون کے مشورے سے ابن زیاد کو کوفہ کی گورنری پر مامور کیا تھا۔

کوفہ میں عمرو بن حجاج زبیدی،یزید بن حرث، عمرو بن حریث، عبداللہ بن مسلم، عمارۃ بن عقبہ، عمر بن سعد، مسلم بن عمرو باہلی، شمر بن ذی الجوشن ،اشعث بن قیس وغیرہ جیسے بنی اُمیہ کے سخت ترین حامی موجود تھے۔یہ لوگ کوفہ میں جہاں بنی اُمیہ کے سیاسی مفادات کا تحفظ کرتے تھے اور وہاں اپنے ذاتی مفادات کے لئے گرگٹ کی طرح رنگ بھی بدل دیتے تھے۔انہی میں کچھ لوگ بظاہر جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ تھے، لیکن درپردہ شامی حکومت کے مفادات کے لئے کام کر رہے تھے۔

لہٰذا جب امیر شام کی موت واقع ہوئی تو انہوں نے کوفہ میں امیر شام کے جانشین اور اُموی شہزادے یزید کی حکومت کی نوخیز جڑیں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور امام حسین علیہ السلام کی تحریک کو ہر ممکنہ طریقے سے نقصان پہنچانے کی سعی کی۔قتل امام حسینؑ کے لئے کوفی سپاہ کو جمع اور متحرک کرنے میں بھی انہی لوگوں کا بہت زیادہ کردار رہا ہے۔ان میں بعض نام تو ایسے ہیں جن کی اہل بیت اطہار سے دشمنی اور خیانتیں اور اُموی حکومت کے تسلط کے لئے کوششوں کو ذکر کرنے کے لئے پوری کتاب درکار ہے۔

بنی اُمیہ کے کوفی حامیوں کے بعد کوفہ کے مسلمان گروہوں میں ''خوارج'' کا نام آتا ہے۔کوفہ کے خوارج جنگ نہروان میں شکست کھانے کے بعد امیر شام کی حکومت کے زمانے میں حکومت کی غیر اسلامی

سیاست کی وجہ سے اُس کے سخت ترین مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔لہٰذا اُنہوں نے ۴۳ ہجری میں کہ جب ''مغیرہ بن شعبہ'' والی کوفہ تھا،ایک شورش برپا کردی تھی جس کی قیادت ''مستور بن علقہ'' کے ہاتھ میں تھی، لیکن خوارج کی یہ شورش شکست سے دوچار ہو گئی تھی۔

''زیاد بن ابیہ'' نے بھی ۵۰ ہجری میں کوفہ کی امارت ہاتھ میں لینے کے بعد اس گروہ کو دبانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، لیکن زیاد کی موت کے پانچ سال بعد ۵۸ ہجری میں انہوں نے ''حیان بن ظبیان'' کی قیادت میں ایک بار پھر شورش برپا کردی تھی۔عبید اللہ ابن زیاد نے بھی کوفہ کی امارت حاصل کرنے کے بعد خوارج کو دبانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔اس طرح اُموی حکومت کے خلاف ان کی ہر کوشش کو دبا دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے واقعہ کربلا میں یہ گروہ نہ تو مخالفت امام حسینؑ میں اور نہ حضرت کی حمایت میں کوئی خاص کردار ادا کر سکا۔(20)

خلاصہ یہ کہ کوفہ میں مذکورہ بالا سیاسی واعتقادی گروہوں کے علاوہ اکثریت ایسے غیر جانبدار اور ابن الوقت لوگوں کی تھی کہ جو فقط اپنے پیٹ اور شہوت کی فکر میں رہتے تھے۔جن کا کوئی سیاسی اور مذہبی نظریہ نہیں تھا جس طرف مادی اور دنیوی مفاد دیکھتے تھے اُسی طرف ہو جاتے تھے۔اگر اُنہیں تلوار دکھائی جاتی تو اُس کے آگے سر جھکا دیتے تھے اور اگر سکوں کی آواز سنائی جاتی تو اُن کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

ان لوگوں نے جب مسلم بن عقیلؑ کی کامیابی کے آثار دیکھے تو اُس کی طرف جھک گئے تھے، لیکن جب اُس کی شکست کے آثار نظر آنے لگے تو میدان سے فرار کرنے لگے تھے اور مسلم بن عقیلؑ کے حقیقی طرفداروں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے لگے تھے۔یہی لوگ تھے جن کی ابن الوقتی کی وجہ سے مسلم بن عقیلؑ کی تحریک کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔پھر جب ابن زیاد نے کوفہ پر تسلط حاصل کرلیا تو اُس کے وعدہ اور وعید کی وجہ سے امام عالی مقام کے مقابلے میں لشکر عمر بن سعد میں شامل ہوگئے تھے۔لہٰذا یہی لوگ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا سبب بنے اور انہوں ہی نے یزیدی حکومت کی ظاہری کامیابی کی بنیادیں فراہم کی تھیں۔اگر مسلم بن عقیلؑ کامیاب ہو جاتے تو یہی لوگ کوفہ میں حکومت مسلم کے زبردست حامی بن جاتے۔

۳۔ کوفی معاشرے کی نفسیات

اہل کوفہ کی اجتماعی نفسیات کے مطالعہ سے بھی لشکر عمر بن سعد میں اُن کی کثرت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ا۔ تاریخ کی روشنی میں کوفی معاشرے کی نفسیات سے پتا چلتا ہے کہ اس معاشرے کی بنیادیں بدوی اور صحرائی قبائل پر قائم تھیں جو مختلف وجوہات کی بناپر اسلامی فتوحات میں شریک ہوتے رہے تھے اور پھر انہوں نے صحرائی اور خانہ بدوشانہ زندگی سے منہ موڑ کر شہری زندگی اختیار کرلی تھی لیکن ان کی عادات اور خصلتیں پرانی ہی تھیں جس میں سے سب اہم چیز کسی خاص اجتماعی نظام اور قانون کے تابع نہ ہونا تھا کوفیوں کی اکثریت انہی قبائلی عادتوں کی وجہ سے کسی حکومتی نظام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ چونکہ صحرائی اور خانہ بدوش طرز زندگی آزاد اور قوانین سے ماوراء زندگی ہوتی ہے وہ کسی قسم کی پابندی کو قبول نہیں کرتی۔

لہٰذا کوفہ میں سکونت اختیار کرنے کے باوجود وہ شہر کے قوانین اور حکومتی نظام کو قبول نہیں کرتے تھے اور ہر امیر اور والی کے خلاف ہو جاتے تھے یہاں تک کہ خلیفہ دوم کو تنگ آ کر کہنا پڑا: ''وای نائب اعظم من ماۃ الف لایرضون عن امیرو لا یرضی عنھم امیر'' یعنی اس سے بڑی مصیبت کیا ہو سکتی ہے کہ تم کو لاکھوں کی آبادی کا سامنا ہو اور وہ نہ اپنے امیر سے راضی ہو اور نہ امیر اُن سے راضی ہو سکیں۔ (21)

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اہل کوفہ اپنی پوری تاریخ کے دوران حضرت علی علیہ السلام اور عمار یاسر جیسے عادل حاکموں سے بھی ناراض رہے ہیں اور زیاد بن ابیہ جیسے ظالم والیوں کے بھی مخالف رہے ہیں۔ صحرائی عادات واطوار کے علاوہ کوفہ میں بزرگ صحابہ اور قاریان قرآن کی موجودگی نے بھی کوفیوں کی اس خصلت کو شدت بخشنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو حکومت وقت کے مقابلے میں مجتہد اور صاحب رائے سمجھتے تھے۔

لہٰذا جہاں تک اپنی جان کو خطرے سے دور سمجھتے، حکومت کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے، جس کی سب سے نمایاں مثال جنگ صفین میں دیکھی جاسکتی ہے خصوصاً نہروان کے خوارج کی ایک بڑی تعداد قرآن کے قاریوں اور حافظوں پر مشتمل تھی۔ (22) اور وہ اپنے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے خواہ وہ حضرت علی علیہ السلام جیسا امام عادل ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا ایسا معاشرہ کبھی بھی عادل امیر کو برداشت نہیں کرسکتا بلکہ ایسے معاشروں میں ایسے عادل اور عالم حکمرانوں سے سوء استفادہ کیا جاتا ہے اور

اس کے مقابلے میں اپنی رائے اور نظر کو بہتر خیال کیا جاتا ہے، اس کا واضح ترین نمونہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ کوفیوں کا رویہ تھا۔ لیکن اس معاشرے کے لئے زیاد بن ابیہ جیسے حکمران ہی مناسب ہوتے ہیں جو انہیں اپنی ظالمانہ روش کے ذریعے مہار کرتے ہیں اور اپنی اطاعت کراتے ہیں۔

۲۔اہل کوفہ کی دوسری نفسیاتی خصوصیت اُن کی دنیا پرستی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ صدر اسلام کے بہت سے مسلمان فقط خدا کی رضا اور اسلام کی ترقی وپیشرفت کی خاطر فتوحات اسلامی میں شریک ہوتے تھے لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو مال غنیمت کی خاطر جنگ کرتے تھے۔یہ لوگ کوفہ میں سکونت کے بعد مال ودولت کے عادی ہوچکے تھے اور دینی مقاصد کی خاطر اپنی دنیا کو ہاتھ سے کھونے کے لئے تیار نہیں تھے۔

جب بھی اُنہیں اپنے مادی اور دنیوی مفادات خطرے میں نظر آتے، میدان جنگ سے عقب نشینی کر لیتے تھے اور جب بھی مادی مفادات کی اُمید ہوتی تو جنگ میں داخل ہو جاتے تھے۔اس کی واضح ترین مثال جنگ جمل کے مقابلے میں جنگ صفین میں کوفیوں کی کثرت ہے۔اسی لئے جب جنگ جمل میں حضرت علیؑ کی طرف سے جب جنگی غنائم تقسیم نہیں ہوئے تو بہت سے خواص نے بھی امام علیہ السلام پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے تھے جبکہ جنگ صفین میں کوفیوں کو حکومت علوی کی کامیابی کی زیادہ اُمید تھی چونکہ جنگ میں کامیابی مال غنیمت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

شروع شروع میں مسلم بن عقیلؑ کی بیعت کرنے والی کی کثرت کی بھی یہی وجہ تھی اگرچہ ان بیعت کرنے والوں میں چند ایک مخلص افراد بھی تھے۔لیکن شروع میں اہل کوفہ نے امیر شام کی موت اور یزید کی جوانی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے حکومت شام کو کمزور اور متزلزل سمجھ لیا تھا اور پھر کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو مسلم بن عقیلؑ کا مقابلہ کرنے میں غیر سنجیدہ سمجھا تو بعض مخلص شیعوں کی طرف سے امام حسین علیہ السلام کو دعوت دی گئی تو کوفیوں نے اس کا بھرپور استقبال کیا۔چونکہ وہ اس وقت تک مسلمؑ کی کامیابی کو یقینی سمجھتے تھے، لیکن بعد میں ابن زیاد کی آمد نے اُن کے تمام خیالات کو غلط ثابت کر دیا اور اُنہیں پتا چل گیا ہے کہ اب امتحان کا وقت ہے اور اُن کی دنیا اور مادی مفادات خطرے میں پڑ چکے ہیں۔

لہٰذا اُنہوں نے فوراً مسلم بن عقیلؑ سے منہ موڑ لیا۔ حتیٰ عبید اللہ ابن زیاد کے کوفہ میں داخل ہونے کے بعد بھی بعض کوفیوں میں کامیابی کی اُمید باقی تھی اور اُنہوں نے دار الامارہ تک مسلمؑ کا ساتھ دیا لیکن جب اُنہیں مسلمؑ کی ناکامی کا یقین ہو گیا تو اُنہوں نے جلدی سے اپنے آپ کو مسلمؑ کی تحریک سے الگ کر لیا اور مسلم اور ہانی کو ابن زیاد کے سپرد کر دیا۔ اور پھر ابن زیاد کے لوگوں کی طرف شامی افواج کے کوفہ کی طرف چل پڑنے کی افواہوں نے بھی دنیا پرست کوفیوں کے پاؤں متزلزل کر دیئے اور وہ شامی فوج کے خوف سے کانپنے لگے تھے۔(23) اور یہ اُن کی دنیا پرستی کی سب سے بڑی علامت تھی۔ یہاں ہمیں امام حسین علیہ السلام کے اس کلام کی گہرائی اور عظمت کا پتا چلتا ہے کہ جس میں آپؑ نے فرمایا تھا:

"الناس عبید الدنیا و الدین لعق علی السنتهم یحوطونه ما درت معایشهم، فاذا محصوا بالبلاء قل الدیانون۔" (24)

یعنی "لوگ دنیا کے غلام ہیں اور دین تو اُن کے لئے لقلقہ زبان ہے، اُس وقت تک دین کے پیچھے چلتے ہیں کہ جب تک اُن کی معیشت برقرار رہتی ہے اور جب امتحان وآزمائش میں پڑتے ہیں تو دین دار بہت تھوڑے رہ جاتے ہیں۔"

۳۔ کوفیوں کی تیسری بڑی نفسیات اُن کا جذباتی ہونا ہے، اہل کوفہ کی تاریخ کے مطالعہ سے ان کا جذباتی ہونا بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ کوفیوں کی اس نفسیاتی خصلت کا بنیادی سبب اُن کے اندر ایمان کی کمزوری اور معرفت دین کی کمی تھی۔ واضح ہے کہ جن لوگوں نے فتوحات کے بعد شوکت اسلام کو دیکھ کر دین قبول کیا ہو اور اپنی دنیا کی خاطر جنگ وجہاد کرتے ہوں، اُن سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ یہی جذباتیت تھی کہ کوفی مختلف حوادث میں اپنے احساسات وجذبات کے تابع ہو جاتے تھے اور اپنا رنگ بدلنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔

جذباتی لوگ ایک مقام پر نہیں ٹھہر سکتے اور کسی ایک نظریئے اور عقیدے کے پابند نہیں رہ سکتے۔ کوفیوں کی یہی نفسیات اُنہیں بے وفائی اور وعدہ خلافی کی طرف لے جاتی رہی ہے اور آج تک اُن کی بے وفائی اور وعدہ خلافی ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ تاریخ میں کوفیوں کی اسی جذباتی خصوصیت سے جس رہنما نے سب زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے وہ مختار ثقفی تھا لیکن جب کوفیوں نے دیکھا کہ حالات مختار کے خلاف ہو چکے ہیں تو اُنہوں نے اُسے بھی تنہا چھوڑ دیا تھا یہاں تک کہ وہ مصعب بن زبیر کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔(25)

اسی طرح مؤرخین اور تجزیہ نگاروں نے اہل کوفہ کے قول وفعل میں تضاد، فریب کاری، والیان حکومت کی نافرمانی، مشکلات کے وقت فرار، حرص ولالچ اور پروپیگنڈے سے جلد متاثر ہوجانا، کوفی معاشرے کی اہم خصوصیات کے طور پر ذکر کی ہیں۔(26)

کوفیوں کی طرف سے امامؑ کو دعوت اور خطوط کے اسباب

۴۹ یا ۵۰ ہجری میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادت کے بعد سب سے پہلے جعدۃ بن ہبیرہ بن ابی وہب نے امام حسین علیہ السلام کو دعوت پر مبنی خط لکھا کہ جس کے جواب میں امام علیہ السلام نے اپنے برادر محترم امام حسنؑ اور معاویہ بن ابی سفیان کے درمیان ہونے والے عہد نامے کے احترام میں اس دعوت کا منفی جواب دیا تو اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔(27)

اس کے بعد امیر شام معاویہ بن ابی سفیان کی موت اور امام عالی مقام کی طرف سے یزید کی بیعت سے انکار کے بعد جب امام علیہ السلام مدینہ سے مکہ کی طرف چل پڑے تو خطوط اور دعوت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا اور اس میں اس قدر شدت پیدا ہوگئی کہ ان خطوط کی تعداد ۱۲ہزار تک جا پہنچی۔(28) ہوسکتا ہے ۱۲ہزار سے مراد ایک ہی خط میں بہت سے لوگوں کے نام اور دستخط ہوں۔امام علیہ السلام نے ان سب خطوط کو ایک تھیلے میں جمع کیا ہوا تھا اور کوفہ کی طرف سفر کے دوران یہ خطوط امامؑ کے ساتھ تھے۔(29)

ان خطوط کے سلسلے میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔یہ خطوط لکھنے والوں میں چند ایسے لوگ بھی ہیں جو امام علی علیہ السلام کے خاص شیعہ شمار ہوتے تھے جن میں سلیمان بن صرد خزاعی، رفاعۃ بن شداد بہ جلی، مسیب بن نجبہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ان لوگوں نے امام علی علیہ السلام کی عادلانہ حکومت کو دیکھا ہوا تھا اور امام علیؑ کی شہادت کے بعد بنی اُمیہ کے بیس سالہ دور حکومت اور تسلط میں شیعوں کے بارے میں اُن کے ظلم وجور سے تنگ آچکے تھے۔جس کی وجہ سے وہ بنی اُمیہ کے خلاف قیام کی معمولی سی فرصت کو بھی ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے تھے۔لہٰذا امام حسین علیہ السلام کی شخصیت اور پھر بیعت یزید سے انکار اُن کی اس آرزو کے پورا ہونے کا بہترین موقع تھا۔

۲۔حضرت امام علی علیہ السلام کی حکومت کے دوران کوفہ اسلامی مملکت کے بہترین شہروں میں شمار ہونے لگا تھا کیونکہ مملکت کا سرکاری دار الخلافہ تھا۔اس زمانے میں شام، کوفہ کا رقیب شہر سمجھا جاتا تھا جہاں بنی اُمیہ کا تسلط تھا چونکہ بنی اُمیہ کی حکومت کی سرکاری حیثیت مشکوک تھی اس لئے کوفہ کو اس کے مقابلے

میں سرکاری حیثیت حاصل تھی ۔ جس کی وجہ سے کوفہ یہاں کے رہنے والوں کے لئے اجتماعی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد پوری اسلامی مملکت پر بنی اُمیہ کا تسلط قائم ہوجانے کے بعد یہ شہر امیر شام کی طرف سے سیاسی واجتماعی لحاظ سے خصوصی بے اعتنائی کا نشانہ بن گیا اور اس کا شمار عام شہروں میں ہونے لگا۔

اس لئے امیر شام کی موت کے بعد یہاں کے لوگ اس شہر کی سابقہ حیثیت کو لوٹانے کے خواہش مند تھے اور اس کی عظمت رفتہ کہ جس کی اُنہوں نے قدر نہیں کی تھی دوبارہ بحال کرنے کی سعی کرنے لگے تھے۔ لہٰذا ہم امام حسین علیہ السلام کو کوفیوں کی طرف سے لکھے جانے والے خطوط کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

۳۔ لہٰذ امرگ معاویہ کے بعد جب امام علیہ السلام کو خطوط اور دعوت کا سلسلہ شروع ہوا تو جذباتی کوفیوں میں بہت زیادہ جوش وخروش نظر آنے لگا تھا جس کو دیکھ کر بغیر سوچے سمجھے بہت سے کوفیوں نے امام علیہ السلام کو خط لکھنے شروع کر دیئے تھے۔

۴۔ بعض قبیلوں کے زعما اور سرداروں نے بھی جب دیکھا کہ سب لوگ نواسہ رسولؐ کو دعوت دے رہے ہیں اور کہیں یہ دعوت اہل بیت کی حکومت کی بنیاد نہ بن جائے اور اس وقت ہم پیچھے رہ جائیں لہٰذ اہل بیت اطہارؑ سے قلبی بغض وعناد رکھنے اور بنی اُمیہ کی طرف جھکاؤ کے باوجود ان لوگوں نے بھی امام علیہ السلام کو خطوط لکھنے شروع کر دیئے ۔ان لوگوں میں سے زیادہ اہم شبث بن ربعی ، حجار بن ابجر ،یزید بن حارث، قرۃ بن قیس، عمرو بن حجاج زبیدی اور محمد بن عمیر بن عطارد کا نام ہے۔(30)

کوفیوں کی طرف سے آنے والے خطوط میں سب سے زیادہ جذباتی خط انہی لوگوں کے تھے لیکن جونہی حالات تبدیل ہوئے یہ لوگ لشکر عمر بن سعد کے حساس ترین عہدوں پر فائز ہوگئے۔ یہاں تک کہ امام حسین علیہ السلام نے عاشور کے دن لشکر کوفہ کے سامنے کھڑے ہو کر انہی لوگوں کو مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

”یا شبث بن ربعی و یا حجار بن ابجر و یا قیس بن الاشعث و یا یزید بن الحارث الم تکتبوا الی ان قد اینعت الثمار و اخضر الجناب و طمت الجمام و انما تقدم علی جند لك مجند فاقبل۔“(31)

یعنی؛" اے شبث بن ربعی ،اے حجار بن ابجر،اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث ! کیا تم ہی لوگوں نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ پھل پکنے کے قریب ہیں، درخت سرسبز و شاداب ہیں اور تیار لشکر آپ کے لئے حاضر ہے؟"

خلاصہ یہ کہ کربلا میں کوفیوں کی موجودگی کے بہانے شیعوں پر قتل امام حسینؑ کی تہمت کو سمجھنے کے لئے ہمیں ۶۱ ہجری کے کوفی معاشرے کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوفیوں کی آبادی، اجتماعی نفسیات ،امیر شام کی بیس سالہ حکومت کے اثرات اور اس دوران اُموی حکومت کے حامیوں کی کوفہ میں موجودگی اور سیاسی سرگرمیوں اور نظریاتی اور سیاسی تشیع میں فرق کو سمجھے بغیر واقعہ کربلا کے دوران لشکر عمر سعد میں کوفیوں کی کثرت کو شیعہ سے نسبت دینا محض ایک تاریخی مغالطہ ہے۔یہی وہ مغالطہ ہے جس سے معاصر اُموی مبلغین ایک عرصے سے استفادہ کررہے ہیں اور عزاداری امام حسینؑ اور مجالس عزائے حسینی سے عام مسلمانوں کو متنفر کرنے کر سعی کررہے ہیں تاکہ نواسۂ رسول کے قتل اور خاندان رسولؐ کی بے حرمتی کرنے والے اُموی کرداروں کو چھپا سکیں۔

حوالہ جات

1۔ حموی، یاقوت، معجم البلدان، بیروت، دار احیاء التراث العربی، 1399 ق، 491/4

2۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، بیروت، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، 145/3

3۔ ایضاً ج 243/3

4۔ ایضاً، ج 49/4

5۔ دینوری، عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، الامامۃ و السیاسۃ، تحقیق علی شیری، چاپ اول، قم، منشورات شریف رضی، 1371، 185/1

6۔ شریف القرشی، باقر، حیاۃ الامام الحسین بن علی علیہ السلام، دوسرا ایڈیشن: قم، دار الکتب العلمیۃ، 1397 ق، 178/2 بہ نقل از تاریخ الشعوب الاسلامیۃ، 147/1

7۔ معجم البلدان، 491/4

8۔ تاریخ طبری، 494/4؛ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، تصحیح محمد باقر بہبودی، تہران، المکتبۃ الاسلامیۃ، 337/44

9۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، 334/44

10۔ (ایضاً، ص ۳۳۷)

11۔ (ایضاً، ص ۶۸)

12۔ (ایضاً، ج ۴۵، ص ۴)

13۔ زیدی، محمد حسین، الحیاۃ الاجتماعیۃ و الاقتصادیۃ فی الکوفۃ فی القرن الاول الھجری، بغداد، جامعۃ بغداد، 1970 م/42

14۔ جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، بیروت، منشورات دار مکتبۃ الحیاۃ، 338/4

15۔ شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسین علیہ السلام، 438/2

16۔ فتوح البلدان، /279

17۔ فتوح البلدان، 279

18۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسین، ج ۲، ص ۴۳۸

19۔ طبری، تاریخ طبری، ج ۴، س ۲۶۵

20۔ تاریخ طبری، 132/4

21۔ تاریخ طبری، 243/3

22۔ مسعودی، مروج الذہب، 405/2

23۔ تاریخ طبری، 277/4

24۔ موسوعۃ کلمات الامام الحسین علیہ السلام، چاپ اول: قم، دار المعروف، 1415ق، ص373

25۔ تاریخ طبری، 558/4

26۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسین علیہ السلام، 420/2

27۔ الاخبار الطوال، 221

28۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، 334/44

29۔ تجارب الامم، 59/2

30۔ الاخبار الطوال، 229

31۔ مفید، الشیخ، الارشاد، مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام لتحقیق التراث، الثانیۃ، ۱۴۱۴ھ - ۱۹۹۳م، دار المفید للطباعۃ والنشر والتوزیع - بیروت - لبنان، ج ۲ - ص ۹۸

اصحاب حسینؑ کا جذبہ وفاداری

ڈاکٹر عباس حیدر زیدی*
abbaspsc@yahoo.com

کلیدی کلمات: بیعت، اصحاب حسینؑ، ابن زیاد، عمر ابن سعد، لشکر عمر سعد

خلاصہ

حسینی جانثاروں نے تاریخ پر اپنی شہادت کے ذریعے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے امام سے نصرت کا وعدہ احسن طریقے سے پورا کرتے ہوئے شہادت کو گلے لگالیا اور رہتی دنیا تک وفاداری کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرگئے۔ یزید نے حاکم مدینہ کو لکھا کہ حسین ابن علی اور چند دوسرے افراد سے بیعت لو اور اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو ان کے سر قلم کرکے بھیج دو۔ اس وقت تک سوائے چند لوگوں کے تمام حجاز، یمن اور شام و کوفہ نے یزید کی بیعت کرلی تھی، لیکن یزید نے اپنی ہٹ دھرمی سے ان سے بھی بیعت لینے کے لئے دباؤ ڈالا۔ حضرت امامؑ نے بیعت سے انکار کردیا اور اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں امامؑ کو پتا چلا کہ دشمن یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ لہٰذا آٹھ ذوالحجہ کو شہر کوفہ کی طرف چل پڑے۔ اس وقت اصحاب حسینی نے مختلف موقعوں پر جن جذبات کا اظہار کیا اور جو کردار ادا کیا، اُس سے اُن کے جذبہ وفاداری کا پتا چلتا ہے۔ اپنے انہی اصحاب کی گفتگو سن کر حضرت امام نے اپنی بہن جناب زینب کو تسلی دی کہ یہ میرے ساتھ ہیں اور اصحاب حسینی نے بھی اپنی تلواریں نیام سے نکال کر کہا کہ اب یہ تلواریں نیام میں نہیں جائیں گی جب تک یہ ان کے دشمنوں پر نہ چل جائیں۔ اصحاب امامؑ کے جوش و ولولہ کو ہم اپنے الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے سر جھکانے کے بجائے سر کٹانے کو ترجیح دی۔ اصحاب حسینی کی شہادت کے موقع پر حضرت امامؑ نے ان سے جو کلمات ادا کیے وہ بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اس مقالے میں جہاں اصحاب حسینی کے جذبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہاں امام عالی مقام کی طرف سے بھی ان تاریخی کلمات کو پیش کیا گیا ہے جو امام نے اپنے باوفا اصحاب کے بارے میں ادا کئے تھے۔

---

*۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔

مقدمہ

حضرت امام حسین علیہ السلام کو جو جانثار صحابی میسر آئے ،انہوں نے تاریخ پر اپنی شہادت کے ذریعے انمٹ نشانات چھوڑے اور کربلا کی تاریخ ان کے مقدس خون سے رقم کی گئی۔ہم نے اس مقالے میں حسینی اصحاب کے جذبہ وفاداری کو تاریخ سے اخذ کرکے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ ان میں یہ جذبہ وفاداری اس حد تک تھا کہ انہوں نے اپنے امام کی نصرت کرنے کا جو وعدہ کیا اسے احسن طریقے سے پورا کیا اور رہتی دنیا تک وفاداری کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرگئے۔

یزید بن معاویہ نے اقتدار پر قبضہ کرتے ہی سب سے پہلے یہ حکم مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو بھیجا تھا کہ حسین ابن علی علیہ السلام، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر سے بیعت لو اور اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو ان کے سر قلم کرکے میرے پاس شام بھیج دو۔ یہ ایک ایسی صورتحال تھی کہ یزید کی بیعت تمام حجاز، یمن اور شام و کوفہ کے شہر والوں نے کرلی تھی لیکن چندلوگوں ہی نے اس کی بیعت سے انکار کردیا تھا لیکن یزید نے اپنی ہٹ دھرمی سے انہیں بھی اپنی بیعت کروانے کے لئے دباؤ ڈالا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بیعت سے انکار کردیا اور اپنے اعزہ و اقرباء اور چند ساتھیوں کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مکہ میں چند ماہ قیام کے دوران حضرت امام حسین علیہ السلام کو اندازہ ہوگیا کہ ان کے دشمن یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے لہٰذا آٹھ ذوالحجہ کو شہر کوفہ کی جانب عازم سفر ہوئے۔اب ہم اصحاب حسینی کے ان جملوں کو بیان کرتے ہیں کہ جو انہوں نے مختلف موقعوں پر کہے اور جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے امام کی نصرت کا جو وعدہ کیا اسے احسن طریقے سے پورا بھی کیا۔

حضرت مسلم بن عقیلؑ جب کوفہ آئے تو انہوں نے حضرت مختار ثقفی کے یہاں قیام کیا۔لوگ جوق درجوق آنے لگے اور حضرت مسلم بن عقیلؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔عابس بن ابی شبیب شاکری جو اس مجمع میں موجود تھے ،اُٹھے اور خدا کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا: ”أما بعد فانیّ لا أخبرك عن الناس ... ولأضربن بسیفی دونكم حتی ألقی الله لا أرید بذلك الا ما عند الله۔“ یعنی: ”اے کوفہ والوں ! مجھے آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے، میں نہیں جانتا کہ تمہارے دل میں کیا ہے، نہ میں آپ حضرات کو فریب دینا چاہتا ہوں لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میرے ضمیر کی آواز ہے اور اسی کو تسلیم کرتا ہوں اور وہ یہ

کہ میں پورے طریقہ سے تیار ہوں جب بھی میری ضرورت پڑے گی میں دریغ نہیں کروں گا، آپ کی رکاب میں اس شمشیر کے ساتھ جو کہ میرے ہاتھ میں ہے دشمنوں سے جنگ کروں گا اس سے میرا مقصد رضائے خدا اور اس کی جزا ہے۔" (1)

عابس بن ابی شبیب شاکری وہ شخصیت ہیں کہ جنہوں نے اپنے عہد کو پورا کیا اور عاشور کے دن حضرت امام حسین علیہ السلام کی رکاب میں جنگ کرتے ہوئے شہادت پائی اور وفاداری کی مثال قائم کر گئے۔

جب امام حسین علیہ السلام کوفہ کی جانب روانہ ہوئے تو دوران راستہ ایک خط اپنے مخلص ساتھی "قیس بن مسہر صیداوی" کے ذریعے اہل کوفہ کی طرف روانہ کیا۔ اس وقت شہر کوفہ کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی اور اس شہر تک پہنچے والے تمام راستے حکومت کی سخت نگرانی میں تھے۔ ان حالات میں قیس بن مسہر معاویہ و یزید اور ابن زیاد کے بڑے طرفدار حصین بن نمیر کے ہاتھوں گرفتار کر لیے گئے۔ جب ان سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا خط لینے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس خط کو پارہ پارہ کر دیا۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ اس خط کے مضمون اور یہ کہ یہ خط کس کو لکھا گیا ہے آگاہ ہو جاؤ۔" انہیں ابن زیاد کی طرف بھیجا گیا۔ اس نے انہیں حکم دیا کہ منبر پر جا کر حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام پر (نعوذ باللہ) لعنت کرے۔ انہوں نے قبول کیا اور منبر پر جا کر اس طرح کہنے لگے: "اے لوگوں! بے شک حسین بن علی علیہ السلام فرزند زہراؑ ہیں اور وہ سب لوگوں سے افضل و بہتر ہیں اور میں ان کا قاصد ہوں۔"

انہوں نے اپنی گفتگو کے دوران زیاد اور عبید اللہ بن زیاد پر لعنت کی اور حضرت علی علیہ السلام پر درود و سلام بھیجا۔ انہیں دارالامارہ لے جایا گیا اور اس کی چھت سے نیچے گرا کر شہید کر دیا گیا۔ قیس بن مسہر کو جو ذمہ داری دی گئی تھی انہوں نے اسے احسن طریقہ سے ادا کیا اور وہ پیغام جو امام حسین علیہ السلام نے اہل کوفہ کو دیا تھا اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پہنچا دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ کس جگہ تقیہ بہتر ہے اور کہاں تقیہ نہیں کرنا چاہئے۔

ان کے اس طرح اپنے کام کی انجام دہی کی بناء پر ہی اہل کوفہ کو معلوم ہوا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اہل کوفہ کی جانب سے لکھے جانے والے خطوط کی وجہ سے مکہ سے نکل کر شہر کوفہ کے بالکل نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ طبری کے مطابق جب طرماح کے ساتھ چار افراد عمرو بن خالد، سعد، مجمع اور نافع بن ہلال کوفہ

سے روانہ ہو کر مقام "عذیب الجھانات" پر ملے تو ان لوگوں سے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اہل کوفہ کے خیالات پوچھے ۔ان لوگوں نے کوفہ کے حالات بیان کرتے ہوئے امام کے قاصد قیس بن مسہر صیداوی کی شہادت کی اطلاع دی جس پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے قرآن مجید کی آیت تلاوت کی :

"فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۔کچھ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور کچھ اس کے منتظر ہیں اور انہوں نے اپنے وعدے میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔" (2)

پھر آپؑ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: "اے اللہ ! ہمیں اور انہیں جنت عطا فرمااور ہمیں اور ان کو اپنے جوار رحمت میں اکھٹا کرتے ہوئے اپنا ذخیرہ شدہ بہترین ثواب عطا فرما۔" یعنی حضرت مسلم بن عقیلؑ اور قیس بن مسہر کی شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کے نزدیک اپنے عہد سے وفا تھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے لئے دعا کی کہ انہیں اور ہمیں جنت میں ایک ساتھ رکھ اور ہمیں جنت میں اپنی نعمتوں سے نواز۔

کربلا میں ایک بار جب تشنگی کی شدت میں اضافہ ہوا تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت عباس علیہ السلام کو بلایا اور تیس سوار بیس پیادہ سپاہیوں کے ساتھ پانی لانے کے لئے روانہ کیا۔اس جماعت کے ساتھ بیس مشکیں تھیں۔ یہ رات کے وقت فرات کے کنارے پہنچ گئے۔ نافع بن ہلال مخصوص پرچم لئے آگے آگے چل رہے تھے۔ وہاں موجود یزیدی لشکر میں عمرو بن حجاج نے پوچھا کہ کیوں آئے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ اس پانی سے پیاس بجھانے آیا ہوں جس سے ہمیں محروم رکھا گیا ہے۔اس نے کہا: پیو تمھیں گوارا ہے۔ نافع نے کہا: "خدا کی قسم میں اس وقت تک پانی نہیں پی سکتا جب تک حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب پیاسے ہیں۔" یہاں نافع اپنے آقا و مولا کے ایسے فرمانبردار اور مطیع نظر آتے ہیں کہ امامؑ کی محبت میں اپنی پیاس کو بھی کچھ اہمیت نہیں دیتے اور جبکہ ان کو دشمنوں نے اجازت دی کہ وہ پانی پی سکتے ہیں لیکن یہ پانی ان کے امامؑ کے لئے نہیں ہے تو وہ اس پانی پینے کو بھی اپنے اوپر حرام تصور کرتے ہیں کہ جب میرے مولاؑ پیاسے ہیں تو میں بھی ان کے بغیر ہرگز پانی نہیں پی سکتا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے نویں محرم کے دن دشمن نے مہلت ملنے کے بعد غروب آفتاب سے قبل (یا مغرب کے بعد) خاندان ہاشم اور اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا:

"أما بعد ۔ فانی لا أعلم أصحابا أصلح منكم ولا أهل بيت أبر، ولا أفضل من أهل بيتى، فجزاكم الله جميعا عنى خيرا۔ امابعد ! میں نے اپنے اصحاب سے بہتر اصحاب کہیں نہیں دیکھے

اور نہ کسی کے اہل خانہ اپنے اہل بیتؑ سے بڑھ کر باوفا اور حق شناس پائے۔خدا آپ سب کو میری طرف سے جزائے خیر عطاعنایت کرے۔" (3)

آپؑ نے اپنے اسی خطبہ میں اپنے اصحاب کو اجازت دی کہ وہ انہیں چھوڑ کر چلے جائیں۔چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"میرے نانا رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے عراق بلایا جائے گا اور میں عمورا اور کربلا نامی ایک مقام پر ٹھہروں گا اور یہیں شہید کر دیا جاؤں گا۔اب اس شہادت کا وقت آپہنچا ہے۔ میرے خیال میں کل ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کا دن ہوگا۔میں آپ سب کو چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔میں نے آپ سب پر سے اپنی بیعت اٹھالی ہے اور اب آپ لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔رات کی تاریکی نے آپ سب کو چھپایا ہوا ہے،اس سے فائدہ اٹھایئے۔آپ میں سے جو شخص میرے اہل بیتؑ میں سے کسی ایک کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ یہاں سے چلا جائے۔خدا اپ سب کو جزائے خیر عطا عنایت فرمائے۔آپ سب اپنے اپنے علاقوں اور شہروں کی طرف چلے جایئے۔یہ لوگ میرے درپے ہیں اور اگر مجھے مار لیں تو دوسروں سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوگا۔"

حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف سے یہ پیشکش گویا اپنے اصحاب کی آخری آزمائش تھی۔امام حسین علیہ السلام کے اس خطبہ کے جواب میں اصحاب حسینی نے جس جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا وہ ان کے کلمات سے ظاہر ہے۔ہم یہاں ان کے کلمات کو پیش کرتے ہیں۔سب سے پہلے آپؑ کے بھائی حضرت عباس علیہ السلام نے فرمایا:" لا أرانا الله ذلك ابدا (خدا کبھی ایسا دن نہ دکھائے) کہ ہم آپؑ کو چھوڑ کر اپنے گھروں کی طرف واپس چلے جائیں۔" (4) ان کے بعد بنی ہاشم کے تمام ہی افراد نے حضرت عباس علیہ السلام کی گفتگو دہرائی۔امام حسین علیہ السلام نے حضرت عقیل علیہ السلام کے صاحبزادوں کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم لوگوں کی طرف سے مسلمؑ کی قربانی کافی ہے، تم لوگ چلے جاؤ میں تمھیں اجازت دیتا ہوں"۔انہوں نے جواب دیا:

"فقد أذنت لكم... حتى نرد موردك فقبح الله العيش بعدك!"

یعنی: "اگر ہم لوگ چلے گئے اور ہم سے پوچھا گیا کہ اپنے مولا و آقا کو چھوڑ کر کیوں چلے آئے، تو ہم کیا جواب دیں گے؟ نہیں، خدا کی قسم ہم ہر گز ایسا نہیں کریں گے، بلکہ اپنا مال و دولت، جان

اور اپنی اولادیں آپؑ کی راہ میں قربان کر دیں گے آخری دم تک آپ کی رقاب میں رہتے ہوئے جنگ کریں گے۔" (5)

اسی موقع پر حضرت مسلم بن وعوسجہ نے بھی خطاب کیا اور کہا:

"أنحن نخلی عنك ولما نعذر الی الله فی أداء حقك أما والله حتی أکسر فی صدورهم رمحی وأضربهم بسیفی ما ثبت قائمه فی یدی ولا أفارقك ولو لم یکن معی سلاح أقاتلهم به لقذفتهم بالحجارة دونك حتی أموت معك۔

ہم کیسے آپؑ کی مدد سے ہاتھ اٹھالیں؟اس صورت میں خدا کے حضور کیا عذر پیش کریں گے ؟خدا کی قسم میں آپؑ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔اپنے نیزے سے آپؑ کی دشمنوں کے سینے چھید ڈالوں گا اور جب تک تلوار ہاتھ میں ہے،ان سے جنگ کروں گا اور گر کوئی اسلحہ نہ رہا تو پتھروں سے ان پر حملہ کروں گا، یہاں تک کہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردوں۔" (6)

امام حسین علیہ السلام کے ایک صحابی سعید بن عبد اللہ نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

"لا والله یا ابن رسول الله لا نخلیك ابدا حتی یعلم الله انا قد حفظنا فیك وصیة رسوله محمد صلی الله علیه و آله وسلم والله لو علمت انی اقتل فیك ثم أحیا ثم أحرق حیا ثم اذری یفعل ذلك بی سبعین مرة ما فارقتك حتی القی حمامی دونك وکیف لا افعل ذلك وانما هی قتلة واحدة ثم ؟؟ نال الکرامة التی لا انقضاء لها ابدا۔

خدا کی قسم !ہم ہر گز آپؑ کی مدد ترک نہیں کریں گے ،تاکہ خدا کے حضور ثابت کر سکیں کہ ہم نے آپؑ نے سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کے حق کا لحاظ رکھا ہے۔خدا کی قسم گر مجھے معلوم ہو کہ ستر مرتبہ مارا جاؤں گا اور ہر مرتبہ میرے جسم کو جلا کر راکھ کرنے کے بعد زندہ کیا جائے گا تب بھی میں آپؑ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا اور ہر مرتبہ زندہ ہونے کے بعد آپؑ کی مدد کروں گا، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ موت صرف ایک ہی مرتبہ آئے گی اور اس کے بعد اللہ کی لازوال نعمتیں ہیں۔" (7)

آپؑ کے ایک اور صحابی زہیر ابن قین نے یوں گفتگو کی:

"والله لوددت أنی قتلت ثم نشرت ثم قتلت حتی أقتل هکذا ألف مرة ، وأن الله تعالی یدفع بذلك القتل عن نفسك ، وعن أنفس هؤلاء الفتیان من أهل بیتك۔

اے فرزندؑ رسول ﷺ ! خدا کی قسم میں تو چاہتا ہوں کہ آپؑ کی حمایت میں ہزار بار مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر مارا جاؤں اور ہر بار میری یہ آرزو ہو کہ میرے مارے جانے سے آپؑ یا ان بنی ہاشم کے کسی جوان کی جان بچ جائے۔" (8)

اسی اثناء میں امام حسین علیہ السلام نے ایک صحابی محمد بن بشیر حضرمی کو خبر ملی کہ ان کا بیٹا قید کرلیا گیا ہے۔امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: تم میری طرف سے آزاد ہو، جاؤاور اپنے بیٹے کو چھڑانے کی کوشش کرو۔ محمد بن بشیر نے فرمایا:

"خدا کی قسم میں کسی بھی صورت میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔اگر میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں تو جنگل کے درندے میرے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنی غذا بنالیں۔" (9)

امام حسین علیہ السلام نے چند قیمتی لباس انہیں دیئے تاکہ وہ یہ لباس ان لوگوں کے حوالے کردیں جو ان کے بیٹے کو چھڑانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے بنی ہاشم کے افراداور اپنے جانثار اصحاب کے کلمات سنے تو فرمایا: "خداتم سب کو بہترین جزاعنایت فرمائے۔" پھر فرمایا: "میں کل مارا جاؤں گا اور آپ سب بھی مارے جائیں گیء، کوئی ایک بھی نہ بچے گا یہاں تک کہ قاسمؑ اور شیر خوار عبداللہؑ بھی باقی نہیں رہیں گے۔" یہ سن کر آپؑ کے اصحاب نے ہم آواز ہو کر کہا:

"الحمد لله الذی أکرمنا بنصرك ، وشرفنا بالقتل معك ، أو لا (٢) نرضی أن نکون معك فی درجتك یابن رسول الله۔

ہم بھی خدا کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں آپؑ کی مدد کی توفیق دے کر فضیلت بخشی اور آپؑ کے ہمراہ شہادت دے کر عزت و شرافت عنایت کی۔اے فرزندؑ رسول ﷺ ! کیا ہم اس بات پر خوش نہ ہوں کہ جنت میں آپؑ کے ساتھ رہیں گے۔" (10)

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو اجازت دی کہ وہ انہیں چھوڑ کر چلے جائیں لیکن ان کے اصحاب نے کمال جرائت و بہادری سے کہا کہ ہم آپؑ کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جائیں گے اور وہ الفاظ ادا کیے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ان جملوں میں اپنے امامؑ سے محبت کا جذبہ اس قدر شدید ہے کہ وہ یہ جملے ادا کرتے ہیں کہ اگر اپنی ایک جان کے علاوہ ان کو ایسی ہی ہزار جانیں قربان کرنا پڑیں تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔انہیں جب امام حسین علیہ السلام نے شہادت کی خوشخبری دی تو اس پر انہوں نے خوشی کا

اظہار کیا کہ وہ امامؑ کے ساتھ جنت میں رہیں گے۔انہوں نے امام حسین علیہ السلام کے ساتھ شہادت کو اپنے لئے عزت و شرافت کا باعث سمجھا۔یہی وہ معیار ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ حسینی میں فکرِ حسینی سما گئی تھی۔

شب عاشور اصحاب حسینی میں ہلال بن نافع جو امام حسین علیہ السلام کو اکیلے خیموں سے دور جاتا دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے کہ کہیں کوئی امامؑ کو گزند نہ پہنچادے،آپ کے پاس تشریف لائے تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے چاند کی روشنی میں نظر آنے والی پہاڑیاں نافع کو دکھائیں اور ان سے فرمایا: ''کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ رات کی تاریکی میں ان پہاڑیوں کے درمیان چھپ کر اپنی جان بچالو؟'' نافع بن ہلال امامؑ کے قدموں میں گر پڑے اور فرمایا:

''میری ماں میری موت کا ماتم کرے۔میں نے یہ تلوار ہزر درہم میں خریدی ہے اور یہ گھوڑا بھی ہزار درہم میں خریدا ہے۔اس خدا کی قسم جس نے آپ کی محبت عنایت کرکے مجھ پر احسان کیا ہے،جب تک اس تلوار کی دھار باقی ہے اور جب تک یہ گھوڑا چور نہیں ہو جاتا میں آپؑ کے ساتھ رہوں گا۔''

نافع بن ہلال جو آپؑ کے اصحاب میں سے تھے انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ آپؑ کو تنہا چھوڑ کر ہر گز نہیں جائیں گے چاہے اس کی بناء پر ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔روز عاشور انہوں نے بھی شہادت پائی۔حضرت امام حسین علیہ السلام سے شب عاشور ان کی بہن حضرت زینبؑ نے عرض کیا کہ:

''اے بھائی! کیا آپؑ نے اپنے اصحاب کا امتحان لے لیا ہے؟ کیا ان کی نیت اور استقامت کو جانچ لیا ہے؟ایسا نہ ہو کہ سختی پڑنے پر یہ آپؑ سے دست کش ہو جائیں اور آپؑ کو دشمنوں کے درمیان تنہا چھوڑ دیں۔'' تو امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا:

''واللہ لقد بلوتھم ، فما وجدت فیھم الا الأشوس الأقعس ، یستأنسون بالمنیة دون استئناس الطفل الی محالب أمه۔

خدا کی قسم! میں نے انہیں آزمالیا ہے۔یہ سب شجاع اور ثابت قدم ہیں۔یہ لوگ میرے ہمراہ مارے جانے کے ایسے ہی مشتاق ہیں جیسے کوئی بچہ اپنی ماں کے دودھ کا مشتاق ہوتا ہے۔'' (11)

یہ گفتگو نافع بن ہلال نے سنی تو حبیب ابن مظاہر کے پاس آئے اور بھائی بہن کی گفتگو سنائی۔ حبیب ابن مظاہر نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور خیموں کے نزدیک آکر کہا:

''اے رسول ﷺ کی بیٹیوں اور اے حرم رسول خدا ﷺ! یہ آپ کے جانثار اپنی بے نیام تلواروں کے ساتھ حاضر ہیں۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ یہ تلواریں اس اس وقت تک نیام میں نہیں جائیں گی جب تک یہ آپؑ کے دشمنوں کی گردنوں پر نہ چل جائیں۔ اور آپ کے غلاموں کے ہاتھ میں موجود یہ لمبے اور نیزے ہیں، ہم نے قسم کھائی ہے کہ آپؑ کے دشمنوں کے سینے توڑے بغیر یہ نیزے نیچے نہیں جھکیں گے۔''

اصحاب حسینی میں جو جذبہ وفا موجزن تھا اس کی بنا پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی بہن جناب زینبؑ کو تسلی دی کہ یہ میرے ساتھ ہیں اور اصحاب حسینی نے بھی اپنی تلواریں نیام سے نکال کر کہا کہ اب یہ تلواریں نیام میں نہیں جائیں گی جب تک یہ ان کے دشمنوں پر نہ چل جائیں۔ اس جوش و ولولہ کو ہم اپنے الفاظ میں ادا کرنے سے قاصر ہیں کہ حسینی اصحاب میں کس درجہ کا جوش و ولولہ پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنی جان حضرت امام حسین علیہ السلام پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ انہوں نے سر جھکانے کے بجائے سر کٹانے کو ترجیح دی۔ شب عاشور حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں کے خیموں میں عجیب جوش و ولولہ تھا۔ کوئی اسلحہ تیار کر رہا تھا، کوئی اللہ کی عبادت اور اس کے ساتھ مناجات میں مشغول تھا اور کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔

عاشور کے دن جب عمر بن سعد کی فوج خیموں کی طرف بڑھی تو مسلم بن عوسجہ نے چاہا کہ شمر کا قصہ تمام کر دیں لیکن امام حسین علیہ السلام نے انہیں اس سے باز رکھا۔ عرض کیا: اجازت دیجئے کہ اس فاسق اور ستمگر کے سرغنہ کا کام تمام کروں۔ بہترین موقع ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ اس گروہ سے میں جنگ میں پہل کروں۔'' اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جنگ کرنے میں کبھی بھی پہل نہیں کی جائے جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے یہ کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ جنگ پہل کروں تو یہ حضرت مسلم بن عوسجہ کی فرمانبرداری تھی کہ انہوں نے اپنے امامؑ کی اطاعت میں اپنی فکر کو بھی اطاعت امامؑ کے لئے آمادہ کیا اور جنگ میں پہل نہیں کی۔

جب عاشور کے دن حضرت امام حسین علیہ السلام اور لشکر یزید کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا عمر بن سعد نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے خیموں کی طرف تیر پھینک کر اپنے سپاہیوں سے بولا: امیر کے سامنے گواہی دینا کہ (حسینؑ ابن علیؑ کی طرف) سب سے پہلا تیر میں نے پھینکا ہے۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد لشکر یزید نے اہل حرم کے خیموں کی طرف تیر پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس وقت اصحاب حسینی میں سے بہت کم ایسے افراد تھے جو ان تیروں سے نہ بچے ہوں۔ اس موقع پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"قوموا رحمکم اللہ الی الموت الذی لابد منہ فان ھذہ السھام رسل القوم الیکم۔

اُٹھو! اللہ تم پر رحمت نازل کرے اور اس موت کی طرف بڑھو جس سے فرار ممکن نہیں۔ یہ تیر اس قوم کی جانب سے تمہارے لئے (جنگ کا) پیغام ہیں۔ خدا کی قسم تم لوگوں اور جنت اور دوزخ کے درمیان بس موت ہی فاصلہ ہے، جس سے گذر کر تم جنت میں پہنچوگے اور وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔" (12)

اصحاب حسینی کی شہادت کے موقع پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان سے جو کلمات ادا کیے وہ بھی تاریخ میں محفوظ ہیں اور اس موقع کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ ہم یہاں چند اصحاب کے وقتِ شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کے کلمات بیان کرتے ہیں جو ان کے سینوں پر ہمیشہ کے لئے تمغوں کی مانند چمکتے رہیں گے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے ایک صحابی "واضح" نامی ایک ترک غلام کے سرہانے ان کے وقت شہادت تشریف لائے، انہیں گلے سے لگایا، اپنا دست مبارک ان کے نیچے رکھا اور اپنا چہرہ ان کے چہرے پر رکھا۔ "واضح" امام حسین علیہ السلام کی یہ محبت و شفقت بھرا انداز دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے اور اس اعزاز پر ناز کرتے ہوئے اس طرح کہنے لگے: "من مثلی وابن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ) واضع خدہ علی خدی۔ مجھ جیسا کون ہوگا (جسے یہ اعزاز ملا ہو) کہ فرزندؑ رسول ﷺ نے اپنا رخسار اس کے رخسار پر رکھا ہو؟" (13) اسی عالم میں ان کی روح پرواز کر گئی۔

جب روز عاشور نماز ظہر کا وقت ہوا تو آپؑ کے اصحاب میں حضرت ابو ثمامہ صیداوی نے عرض کیا: اے اباعبداللہ علیہ السلام میں آپؑ کے قربان، یہ گروہ ہمارے نزدیک ہوگیا ہے مجھے آپؑ سے پہلے قتل ہونا چاہئے میں چاہتا ہوں کہ نماز سے فراغت کے بعد خدا سے ملاقات کروں۔ امام حسین علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا: تم نے نماز کی یاد دلائی ہے۔ خدا تمھیں نماز گزاروں میں شمار کرے۔

پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے زہیر ابن قین اور سعید بن عبداللہ سے فرمایا کہ میں نماز ظہر پڑھنا چاہتا ہوں تم سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ نصف اصحاب کے ساتھ امام حسین علیہ السلام نے نمازِ خوف ادا کی۔ جب آپؑ نماز سے فارغ ہوئے تو سعید بن عبداللہ دشمنوں کی تیر بارانی کی وجہ سے زمین میں گرے اور کہا: خدا اس گروہ پر ایسے ہی لعنت کر جس طرح قوم ثمود و عاد پر کی تھی اور اپنے رسول ﷺ پر رحمت نازل فرما، نیز کہا: پالنے والے یہ زخم میں نے تیرے رسول ﷺ کے بیٹے کی نصرت میں تجھ سے ثواب حاصل کرنے کے لئے کھائے ہیں۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کی طرف رخ کرکے فرمایا: اے فرزندؑ رسول ﷺ کیا میں نے اپنا عہد پورا کر دیا؟ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! تم بہشت میں میرے آگے آگے ہوگے۔ اصحاب حسینی نے اس موقع پر عرض کی: ''ہماری جانیں آپؑ پر قربان۔ ہمارا خون آپؑ کے خون کا محافظ۔ خدا کی قسم ہم میں سے ایک بھی زندہ ہے اس وقت تک آپؑ اور آپؑ کے حرم کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔''

مقتل عوالم اور مقتل خوارزمی کے مطابق جب بھی کوئی صحابی میدان کی طرف جاتے تو آپؑ سے یہ کہہ کر وداع ہوتے: ''السلام علیك...'' اور امامؑ جواب میں فرماتے وعلیك السلام... (اور تم پر بھی ہمارا سلام ہو اور ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے ہی آرہے ہیں) اور پھر اس آیت کی تلاوت فرماتے: ''فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا۔ ان میں سے بعض نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اور بعض اپنے وقت کا انتظار کر رہے ہیں اور اپنے عہد و پیمان میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔'' (14)

جب حضرت مسلم بن عوسجہ اپنے ہی خون میں نہا کر زمین پر گرے تو ان میں زندگی کے کچھ آثار باقی تھے کہ امام حسین علیہ السلام آپ کے سرہانے تشریف لائیے اور ان کے پاس بیٹھ کر فرمایا:۔۔۔ ''اللہ تم پر رحمت نازل کرے۔ اے مسلم!'' پھر قرآن مجید کی یہی آیت یعنی سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۲۳ کی تلاوت کی۔ اس موقع پر حضرت حبیب ابن مظاہر نے مسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے مسلم! تمہارا مارا جانا میرے لئے گراں ہے لیکن تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ تم چند ہی لمحوں میں جنت میں ہوگے۔'' حبیب نے مزید فرمایا: ''اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ کے کچھ دیر بعد میں بھی قتل ہو جاؤں گا تو آپ سے کہتا کہ اگر کوئی وصیت ہے تو مجھے بتایئے۔'' تو لہوف میں منقول ہے کہ:

''فقال له مسلم فانی أوصيك بهذا وأشار الى الحسين عليه السلام فقاتل دونه حتى تموت۔

مسلم نے امام حسین علیہ السلام نے طرف اشارہ کرکے انتہائی نحیف آواز میں کہا: ''میری وصیت یہ ہے کہ ان سے پہلے جان دینا۔'' (15)

حبیب ابن مظاہر نے فرمایا: ''میں آپ کی وصیت پر عمل کروں گا۔'' ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ مسلم بن عوسجہ کی روح پرواز کر گئی اور وہ دوسرے شہدائے کربلا سے جاملے۔ مسلم بن عوسجہ کا حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق حبیب سے یہ کہنا کہ ان سے پہلے اپنی جان دینا ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے یہ فرض سمجھتے تھے کہ وہ اور اصحاب حسین حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی آلؑ سے پہلے ان پر فدا ہو جائیں۔ اسی طرح جب حضرت حبیب ابن مظاہر نے جام شہادت نوش کیا تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے بے سر اور زخموں سے چور چور بدن کے قریب کھڑے ہو کر فرمایا: ''میری اور میرے اصحاب کی قربانی اللہ کی رضا کے لئے ہے۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام کے جاں نثار اصحاب میں حضرت ابو ثمامہ صائدی بھی شامل ہیں۔ جب انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ نماز ظہر ادا کی تو دوسرے اصحاب سے پہلے امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا:

> ''اے ابا عبداللہ علیہ السلام! میری جان آپؑ پر فدا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ شہید ہونے والے اپنے ساتھیوں سے جاملوں۔ میرے لئے انتہائی ناگوار ہے کہ میں زندہ رہوں اور آپؑ کو آپؑ کے اہل وعیال کے درمیان تن تنہا قتل ہوتا دیکھوں۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: ''بڑھو، آگے بڑھو۔ جلد ہم بھی تم سے آملیں گے۔'' امامؑ کی اجازت ملتے ہی ابو ثمامہ نے دشمن پر حملہ کیا اور شدید جنگ کی۔ پھر شہید ہوگئے۔ ابو ثمامہ نے یہ فرض سمجھا کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتا نہ دیکھ سکیں۔ لہٰذا انہوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے پہلے وہ شہید ہو جائیں۔ عمرو ابن قرظۃ کعبی نے بھی دوران نماز تیر کھائے اور نماز کے بعد امامؑ سے بھی وہی سوالات کیے جو سعید نے کیے تھے اور امامؑ نے بھی وہی جواب دیا جو سعید کو دیا تھا۔ پھر مزید فرمایا: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرا اسلام پہنچانا اور انہیں بتانا کہ میں بھی تمہارے بعد آرہا ہوں۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام کے ایک صحابی ابو شعساء کا شمار کوفہ کے معروف تیر اندازوں میں ہوتا تھا۔ وہ عمر ابن سعد کے لشکر میں شامل تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی روز عاشور تقریر کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ امامؑ کی کسی تجویز یا مثبت جواب نہیں دیا جارہا تو آپ لشکر حسینی میں شامل ہوگئے، وہ جناب حُر سے پہلے لشکر حسینی میں شامل ہوئے تھے۔ پہلے وہ سوار ہو کر میدان جنگ میں گئے اور جب ان کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیئے گئے تو خیموں میں کی جانب واپس آئے اور خیموں کے سامنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر سو تیر، جو ان کے ترکش میں موجود تھے، سب کے سب لشکر یزیدی کی جانب مارے، اس موقع پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے انہیں دعا دیتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! ان کے تیروں کو نشانے پر لگا اور ثواب میں جنت عنایت فرما۔'' تیر ختم ہونے کے بعد ابو شعساء اٹھے اور کہا: میرے تمام تیروں میں سے صرف پانچ تیر خطا گئے اور باقی سب ٹھیک ٹھیک نشانوں پر دشمن کو لگے۔ اس کے بعد انہوں نے تلوار لے کر یزیدی لشکر پر حملہ کیا اور شہادت کے درجے پر فائز ہوگئے۔

حُر بن یزید ریاحی پہلے لشکر یزیدی میں شامل تھے، پھر وہ لشکر حسینی میں شامل ہوگئے۔ آپ نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے کہا کہ: میں نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ یہ لوگ معاملے کو اس حد تک لے جائیں گے اور سچ مچ آپؑ سے جنگ کرنے لگیں گے، ورنہ ہر گز ان کا ساتھ نہ دیتا۔ میں نے آپؑ کے خلاف جو جو کام کیے ہیں اور آپؑ کا راستہ روکا ہے اب ان سب خطاؤں سے توبہ کے لئے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور اس بات کا عزم کرتا ہوں کہ مرتے دم تک آپؑ کی مدد کروں گا اور آپؑ کے قدموں میں جاں نثار کردوں گا۔ کیا آپؑ میری توبہ قبول فرمائیں گے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: ''ہاں! اللہ تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا''۔ حضرت حُر نے حضرت زہیر کے ساتھ مل کر دشمن پر حملہ کیا۔ ان میں سے جو کوئی دشمن کے محاصرے میں چلا جاتا تو دوسرا محاصرہ توڑ کر اسے دشمن کے حصار سے آزاد کرالیتا۔ یہاں تک کہ حُر کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ انہوں نے گھوڑے سے اُتر کر پیدل ہی جنگ جاری رکھی۔ جب ان کے ہاتھوں دشمن کے چالیس سے زیادہ افراد قتل ہو چکے تو دشمن کے ایک پیدل گروہ نے ان پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ اس موقع پر حضرت امام حسین علیہ السلام کے چند ساتھیوں نے ان کے نیم جاں جسم کو قتل گاہ سے اُٹھا کر اس خیمہ کے پاس رکھ دیا جہاں شہداء کی لاشیں

رکھی تھیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام ان کے نیم جاں جسم کے قریب تشریف لائے جبکہ ان میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی اور آپ نے فرمایا:

''یہ (اہل کوفہ) ایسے ہی قاتلوں کی مانند ہیں جیسے انبیاء اور اولاد انبیاء کے قاتل ہوتے ہیں''۔ اس کے بعد آپؑ حُر کے سرہانے بیٹھ گئے اور ان کے چہرے پر خون اور مٹی کو صاف کرتے ہوئے فرمایا: ''أنت الحر کما سمتك أمك أنت الحر ان شاء اللہ فی الدنیا والآخرۃ۔ تم آزاد مرد ہو، جیسا کہ تمہاری ماں نے تمہارا نام حُر (یعنی آزاد) رکھا تھا۔ تم اس دنیا اور آخرت دونوں میں آزاد ہو۔'' (16)

حضرت امام حسین علیہ السلام کا حضرت حُر کے متعلق یہ فرمانا کہ تم حُر ہو یعنی ''تم آزاد ہو''۔ بڑا پُر معنی اور بلیغ جملہ ہے۔ یعنی تم دراصل اب حُر بنے ہو۔ تم نے لشکر حسینی میں شامل ہو کر دراصل حُریت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب تم لشکرِ حسینی میں ہونے کی وجہ سے حقیقی معنوں میں حُر (آزاد مرد) بن گئے ہو۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے ایک ساتھی زہیر ابن قین جب دشمن پر حملہ کرکے واپس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہوئے فرمایا:

''میری جان آپؑ پر فدا ہو، اے ہدایت یافہ اور ہادی آج میں آپؑ کے جد پیغمبر ﷺ سے ملاقات کروں گا، حسن علیہ السلام، علی مرتضیٰ علیہ السلام اور دوپروں والے مسلح جواں مرد (جعفر طیارؑ) سے ملوں گا۔ اسد اللہؑ، حمزہؓ سے بھی جو ہمیشہ زندہ رہنے والے شہید ہیں۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: ''تمہارے بعد میں بھی اس سے ملاقات کروں گا''۔ جب وہ شدید زخمی ہو کر کربلا کی سرزمین پر گرے تو حضرت امام حسین علیہ السلام ان کے سرہانے تشریف لائے اور فرمایا: ''خدا تمہیں اپنی رحمت سے دور نہ رکھے، اے زہیر! اور تمہارے قاتلوں پر لعنت کرے۔ ایسی لعنت جو گزشتہ قوموں پر کی گئی تو وہ بندر اور سور کی شکل میں مسخ ہو گئے۔''

حضرت امام حسین علیہ السلام نے زہیر کے قاتلوں پر اللہ کی جو لعنت بھیجی وہ ان پر تا روز قیامت برستی رہے گی اور ان قاتلوں کی حمایت کرنے والے بھی اس لعنت میں ہمیشہ ہمیشہ شامل رہیں گے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے ایک ساتھی حنظلہ شبامی بھی تھے، آپ نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے اذن جہاد لینے کے لئے فرمایا: ''کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جاؤں اور اپنے بھائیوں سے جا ملوں جو جنت میں میرے منتظر ہیں۔'' حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ''ہاں، جاؤ اس طرف جو دنیا

اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سے سب بہتر ہے ،ایسی سلطنت جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔" حنظلہ نے دشمنوں پر حملہ کیااور بے جگری سے لڑے یہاں تک کہ شہادت کے درجے پر فائز ہوگئے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے دو جاں نثار ساتھی سیف بن حارث اور مالک بن عبد جو ایک دوسرے کے چچا زاد بھائی تھے ،اس وقت کربلا پہنچے جب ابھی کوفہ اور کربلاکے درمیان آمد و رفت پر پابندی نہیں لگی تھی۔ عاشور کے دن وہ دونوں دشمنوں کی کثرت اور امام حسین علیہ السلام کے اعوان وانصار کی قلّت دیکھ کر رونے لگے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس تشریف لائے۔جب امامؑ نے انہیں روتا دیکھا تو فرمایا: "اے میرے بھائیوں کے بیٹوں! کیوں رو رہے ہو؟خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ کچھ دیر کے بعد تمہاری آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جائے گی (جنت میں داخل ہو کر خوشی اور مسرت ملے گی)۔"ان دونوں جوانوں نے عرض کیا: "اے فرزندؑ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! ہماری جان آپؑ پر فدا ہو ،خدا کی قسم ! ہم اپنے لئے نہیں رو رہے بلکہ آپؑ کے لئے رو رہے ہیں کہ دشمن نے آپؑ کو گھیرا ہوا ہے اور ہم اپنی جان دینے کے سوا،آپؑ کے دفاع کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کی یہ فداکاری دیکھی تو ارشاد فرمایا: "اللہ تمہارے اس احساس وادراک اور میری اس مدد و نصرت کے صلے میں تمہیں متقی اور پرہیز گاروں کا ثواب عنایت فرمائے۔" پھر ان دونوں نے ایک ساتھ جنگ شروع کی اور شہید ہوگئے۔انہیں اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا کہ وہ مارے جائیں گے بلکہ اصل افسوس وملال اس بات پر تھا کہ وہ اپنے مولاوآقا حضرت امام حسین علیہ السلام کے دفاع کے لئے سوائے جان دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے اس احساس کی بدولت انہیں دعادی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں میں سے ایک جون بن حری تھے جو دراصل حضرت ابوذر غفاریؓ کے غلام تھے اور ان کے بعد اہل بیتؑ کے خدمت گزار بن گئے تھے۔حضرت امام حسن علیہ السلام کے زمانے میں ان کے ساتھ رہے اور پھر حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت کرنے کا شرف حاصل کیا۔وہ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلاکے سارے راستے حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہے۔

جب عاشور کے دن جنگ میں شدت آنے لگی تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اذن جہاد طلب کیا۔امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:"اے جون ! میری طرف سے تمہیں اجازت ہے (کہ یہاں سے چلے جاؤاور اپنی جان کی حفاظت کرو) کیونکہ تم سکون اور عافیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے

ہمارے ہمراہ آئے تھے، اب ہماری وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں مبتلا نہ کرو۔" جون نے اپنے آپ کو امامؑ کے قدموں میں گرادیا اور ان کے قدم چومتے ہوئے عرض کیا: "اے فرزندؑ رسول ﷺ! کیا یہ ممکن ہے کہ راحت اور آرائش کے ایام میں تو میں آپؑ کے ساتھ رہوں اور اور بُرے دنوں میں اور مشکلات اور دشمنوں کے درمیان آپؑ کو تنہا چھوڑ کر چلا جاؤں؟ ہاں! میرے بدن سے بدبو آتی ہے، میرا حسب پست ہے اور میرا رنگ سیاہ ہے۔ اب مجھ پر احسان کیجئے تا کہ میرے بدن سے خوشبو آئے، میرا رنگ سفید ہو جائے اور میں عزت و شرافت حاصل کر سکوں۔ خدا کی قسم! میں ہر گز آپ سے جدا نہ ہوں گا، یہاں تک کہ میرا یہ سیاہ خون آپؑ کے خون سے مل جائے۔"

حسین ابن علی علیہ السلام نے یہ جذبہ وفاداری دیکھ کر انہیں جنگ کی اجازت دے دی۔ جب وہ زخم کھا کر زمین کربلا پر گرے تو امامؑ خود ان کے پاس تشریف لائے اور ان کے قریب بیٹھ کر ان الفاظ میں انہیں دعا دی:

"اللھم بیض وجھه وطیب ریحه واحشرہ مع الأبرار وعرف بینه وبین محمد وآل محمد۔"

"اے اللہ! اس کے چہرے کو منور کر دے، اس کے بدن کو معطر کر دے، اسے اپنے نیک بندوں کے ساتھ محشور فرما اور محمدؐ و آلؑ محمدؐ اور اس کے درمیان زیادہ سے زیادہ آشنائی اور واقفیت قرار دے۔" (17)

جون جانتے تھے کہ ان کا حسب پست ہے، ان کا رنگ سیاہ ہے اور ان کے بدن سے بدبو آتی ہے لیکن نصرت حسین علیہ السلام میں اپنی جان فدا کرنے کے لئے تیار تھے۔ اسی لئے حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی ان کی شہادت کے وقت ان کے لئے ایسی ہی دعا کی کہ جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔ شیخ مفید اپنی کتاب الارشاد میں نقل کرتے ہیں کہ جب اصحاب حسینی یکے بعد دیگرے حضرت امام حسین علیہ السلام سے اجازت لے کر اور داد شجاعت دے کر شہید ہو چکے اور آپؑ کے خاص اہلبیتؑ کے علاوہ کوئی آپؑ کا دفاع کرنے والا نہ رہا تو اہلبیتؑ کی باری آئی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو جو اصحاب میسر آئے انہوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور امام حسین علیہ السلام پر اپنی جان قربان کر دی۔ انہوں نے جس عزم کا اظہار کیا کہ وہ حسین ابن علی علیہ السلام کو چھوڑ کر ہر گز نہیں جائیں گے، اپنے وعدے کو احسن طریقے سے نبھایا اور حق وفاداری ادا کرتے ہوئے شہید ہو کر دین حق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید کر گئے۔

حوالہ جات

1۔ طبری، تاریخ الطبری، مراجعۃ و تصحیح وضبط : نخبۃ من العلماء الأجلائ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات- بیروت لبنان، قوبلت ہذہ الطبعۃ علی النسخۃ المطبوعۃ بمطبعۃ "بریل" بمدینۃ لندن فی سنۃ ۱۸۷۹م- ج ۴- ص ۲۶۴

2۔ القرآن، احزاب ۳۳۔ آیت ۲۳

3۔ ابن طاووس، سید، اللہوف فی قتلی الطفوف، مصادر سیرۃ النبی والائمۃ، الأولی، ۱۴۱۷، مہر، أنوار الہدی- قم- ایران- ص ۵۵

4۔ مقتل الحسین (ع)، أبو مخنف الأزدی، تعلیق : حسین الغفاری، مطبعۃ العلمیۃ- قم- ص ۱۰۹

5۔ ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ، ۱۳۸۶-۱۹۶۶م، دار صادر - دار بیروت، دار صادر للطباعۃ والنشر - دار بیروت للطباعۃ والنشر- ج ۴- ص ۵۸

6۔ طبری، تاریخ الطبری، مراجعۃ و تصحیح وضبط : نخبۃ من العلماء الأجلائ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات - بیروت - لبنان، قوبلت ہذہ الطبعۃ علی النسخۃ المطبوعۃ بمطبعۃ "بریل" بمدینۃ لندن فی سنۃ ۱۸۷۹م- ج ۴- ص ۳۱۸

7۔ محسن الأمین، سید، لوائع الأشجان، ۱۳۳۱، مطبعۃ العرفان- صیدا، منشورات مکتبۃ بصیرتی- قم- ص ۱۱۹

8۔ شیخ المفید، الارشاد، مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام لتحقیق التراث، الثانیۃ، ۱۴۱۴- ۱۹۹۳م، دار المفید للطباعۃ والنشر والتوزیع- بیروت- لبنان- ج ۲- ص ۹۲

9۔ عبد اللہ البحرانی، شیخ، العوالم، الامام الحسین (ع)، مدرسۃ الامام المہدی (ع)، الأولی المحققۃ، ۱۴۰۷- ۱۳۶۵ ش، أمیر- قم- ص ۲۴۴-۲۴۵

10۔ ہاشم البحرانی، سید، مدینۃ المعاجز، مؤسسۃ المعارف الاسلامیۃ باشراف الشیخ عزۃ اللہ المولائی، الأولی، ۱۴۱۱، حافظ، مؤسسۃ المعارف الاسلامیۃ- قم- ایران- ج ۴- ص ۲۱۵

11۔ أحمد حسین یعقوب، کربلاء، الثورۃ والمأساۃ، الأولی، ۱۴۱۸- ۱۹۹۷م، الغدیر للطباعۃ والنشر والتوزیع- بیروت- لبنان- ص ۲۹۹

12۔ عبد اللہ البحرانی، شیخ، العوالم، الامام الحسین (ع)، مدرسۃ الامام المہدی (ع)، الأولی المحققۃ، ۱۴۰۷- ۱۳۶۵ ش، أمیر- قم، ص ۲۵۵

13۔ محمد السماوی، شیخ، أبصار العین فی أنصار الحسین (ع)، تحقیق: الشیخ محمد جعفر الطبسی، الأولی، رمضان المبارک ۱۴۱۹- ۷۷ ۱۳ ش، مطبعۃ حرس الثورۃ الاسلامیۃ، مرکز الدراسات الاسلامیۃ لممثلیۃ الولی الفقیہ فی حرس الثورۃ الاسلامیۃ- ص ۹۶

14۔ القرآن، سورۃ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۳

15۔ابن طاووس، سید، اللھوف فی قتلی الطفوف، الأولی، ۱۴۱۷، مہر، أنوار الہدی- قم- ایران- ص ۶۴
16۔ طبری، تاریخ الطبری، مراجعۃ و تصحیح وضبط : نخبۃ من العلماء الأجلائ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات - بیروت - لبنان، قوبلت ہذہ الطبعۃ علی النسخۃ المطبوعۃ بمطبعۃ "بریل" بمدینۃ لندن فی سنۃ ۱۸۷۹م- ج ۴- ص ۳۲۵
17۔ محمد السماوی، شیخ، أبصار العین فی أنصار الحسین (ع)، تحقیق، الشیخ محمد جعفر الطبسی، الأولی، رمضان المبارک ۱۴۱۹- ۷۷ ۱۳ ش، مطبعۃ حرس الثورۃ الاسلامیۃ، مرکز الدراسات الاسلامیۃ لممثلیۃ الولی الفقیہ فی حرس الثورۃ الاسلامیۃ- ص ۱۷۷

عہد جاہلیت سے عہد رسالت تک
بنوہاشم اور بنواُمیہ کی رقابت کاتاریخی جائزہ

ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی
dr.sha_wasti@yahoo.com

کلیدی الفاظ: عہد جاہلیت، بنی ہاشم، بنی اُمیہ، قصیٰ بن کلاب، عبد مناف بن قصیٰ، بنو عدی، بنو تیم۔

خلاصہ

آج بھی بنواُمیہ کے بنوہاشم پر مظالم کی داستان پڑھ کر یہ سوال جنم لیتا ہے کہ آخر بنواُمیہ اور بنوہاشم میں ایسی کونسی رقابت تھی جس کے سبب یہ واقعات رونما ہوئے ؟ لہٰذا اس مقالے میں عہدِ جاہلیت سے عہد رسالتؐ تک بنواُمیہ اور بنوہاشم کی رقابت کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے اجداد میں ایک قصیٰ تھے۔ قصیٰ نے خانہ کعبہ کے متولی حلیل بن حبشیہ الخزاعی کی لڑکی حبّی سے شادی کی۔ جن کے انتقال کے بعد ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے تمام قبائل نے قصیٰ کو خانہ کعبہ کی تولیت سونپ دی۔ قصیٰ کے ہاں چار فرزند پیدا ہوئے جن میں سے دو نے زیادہ شہرت پائی۔ ایک فرزند کا نام عبد مناف بن قصیٰ ہے اور دوسرے فرزند کا نام عبدالعزیٰ بن قصیٰ ہے۔ قصیٰ کے انتقال کے بعد انکے بیٹے عبد مناف نے اپنے والد کی طرح قریش پر حکومت کی۔ ان کے ہاں چھ فرزند پیدا ہوئے۔ ان میں مُطلب سب سے بڑے تھے۔ دوسرے بیٹے عمرو جو تاریخ میں ہاشم کے نام سے معروف ہیں۔ تیسرے فرزند عبد شمس ہیں، یہ ہاشم کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ عبد شمس کے ہاتھ کی ایک انگلی ہاشم کے ماتھے سے جڑی ہوئی تھی جسے چھری سے جدا کیا گیا۔ اس موقع پر یہ پیش گوئی کی کہ ان دونوں بھائیوں کی اولاد کے درمیاں خونریزی واقع ہوگی۔ ہمارے مقالے کا موضوع عمرو (ہاشم) اور عبد شمس کی اولاد (بنی اُمیہ) کی رقابت ہے۔ بنواُمیہ ہمیشہ سے بنوہاشم کے خلاف رہے ہیں۔ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی حیات میں حسب سابق اپنی مکاری سے کام لیا اور چپ سادھ لی جس سے مورخین نے یہ سمجھا کہ بنواُمیہ کی بنوہاشم سے رقابت ختم ہوگئی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ اُموی مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد اُموی ایک بار پھر سرگرم ہوگئے اور بالآخر اپنی مکاری کے بل بوتے پر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ان مظالم کی داستان بنوہاشم کے خون سے تاریخ کے اوراق پر رقم ہوئی۔

مقدمہ

چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بنو اُمیہ کی جانب سے بنو ہاشم پر کیے گئے مظالم کی داستان تاریخ کے اوراق پر رقم ہونے کے ساتھ ساتھ اہلبیتؑ رسول ﷺ کے پیروکاروں کے دلوں پر اس طرح نقش ہو گئی ہے اسی لیے ہر سال وہ ان دردناک اور ہولناک واقعات کی یاد کرتے ہیں اور محرم الحرام کے ایام میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے واقعہ کربلا کچھ عرصہ قبل ہی رونماء ہوا ہے جس سے عام لوگوں کے دلوں میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ آخر بنو اُمیہ اور بنو ہاشم میں ایسی کونسی رقابت تھی جس کے سبب یہ واقعات رونماء ہوئے لہٰذا ہم نے اس مقالے میں عہدِ جاہلیت سے عہد رسالت ﷺ تک بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کی رقابت کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔

چوتھی صدی عیسوی کے آغاز پر پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد امجد کلاب بن مرہ نے قضاعہ قبیلہ میں فاطمہ بنت سعد سے شادی کی فاطمہ بنت سعد کے قبیلے کے افراد شام میں رہائش پذیر تھے۔ فاطمہ بنت سعد سے شادی کے نتیجہ میں کلاب بن مرہ کے ہاں فاطمہ بنت سعد کے بطن سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ بڑے فرزند کا نام زُہرہ رکھا گیا جب زہرہ سنِ بلوغت کو پہنچے تو دوسرے فرزند کی پیدائش ہوئی جن کا نام زید رکھا گیا۔ زید کی شیر خواری کے دوران ہی کلاب بن مرہ کا انتقال ہو گیا تو فاطمہ بنت سعد کے میکہ والوں کی وطن سے دوری اور شوہر کی وفات نے فاطمہ بنت سعد کو مغموم کر دیا تھا جس کے سبب سسرال اور میکے والے سب ہی ان کے بارے میں متفکر رہتے تھے۔

زید جب شیر خواری سے فارغ ہوئے تو خاندان والوں اسرار کیا کہ فاطمہ بنت سعد دوسری شادی کر لیں جس پر مجبور ہو کر فاطمہ بنت سعد نے ربیعہ بن خرام سے شادی کر لی اور اپنے شیر خوار بچے زید کو سسرال والوں کی اجازت سے اپنے ساتھ مکہ سے اپنے شوہر ربیعہ بن خرام کے ہمراہ اس کے قبیلے بنو عزرہ جو شام میں مقیم تھا وہیں چلی گئیں۔ زُہرہ اُس وقت بالغ تھے جس کے سبب اُن کے خاندان والوں نے زہرہ کو اپنے پاس ہی رکھا لہٰذا یہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ مکہ میں ہی رہے۔ (1)

فاطمہ بنت سعد جب شام میں رہائش پذیر ہوئیں تو شام کے لوگ زید کو پیار میں قصیٰ کے نام سے پکارنے لگے۔ عربی زبان میں قصیٰ کے لغوی معنی اہل لغت نے ''دوری اور پردیسی'' بیان کیے ہیں۔ (2) قصیٰ جوان ہوئے تو ان کی والدہ فاطمہ بنت سعد نے قصیٰ کو ان کے خاندان کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش

ہوئے اور فوری طور پر مکہ معظّمہ جانے کے لیے تیار ہوگئے لیکن اُن کی والدہ نے اُنہیں خاندان والوں سے ملنے کے لیے حج کے موقع پر مکہ معظّمہ جانے کا مشورہ دیا جس پر قصیٰ نے عمل کیا اور وہ حج کے موقع پر مکہ معظّمہ آئے۔ آپ نے پہلے فریضہ حج کیا اور حج سے فارغ ہونے کے بعد اپنے خاندان والوں سے ملے جب خاندان والوں نے انہیں دیکھا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے قصیٰ سے اسرار کیا کہ وہ شام واپس نہ جائیں بلکہ وہ مکہ میں اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہائش اختیار کریں لہٰذا خاندان والوں کی خواہش پر قصیٰ نے مکہ معظّمہ میں سکونت اختیار کرلی۔ (3) قصیٰ کے بڑے بھائی زُہرہ کی نسل سے حضرت آمنہ بنت وہب والدہ پیغمبر اسلام ﷺ پیدا ہوئی تھیں۔ (4)

قصیٰ نے اپنی بصیرت اور شجاعت سے کام لیتے ہوئے مکہ سے طوائف المُلُوکی کا خاتمہ کیا اور مکہ معظّمہ کے پہاڑوں پر آباد قبائل کو جو کہ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے اُنہیں لاکر مکہ معظّمہ شہر کے وسط میں ترتیب سے آباد کیا۔ عربی زبان میں ایک جگہ جمع ہونے کے عمل کو تقرش کہا جاتا ہے اس لئے قصیٰ کی اس آبادکاری کے سبب انہیں قریش کا نام ملا اور اس طرح یہ قبائل قریش کے نام سے مشہور ہوئے۔ (5) قصیٰ نے مکہ معظّمہ شہر کی تعمیر کی اور یہاں ایک فلاحی ریاست کی بنیاد ڈالی جس سے ان قبائل پر قصیٰ کی حکمرانی قائم ہوئی۔ (6)

قصیٰ نے خانہ کعبہ کے متولی حلیل بن حبشیہ الخزاعی کی لڑکی حبّٰی سے شادی کی ان کے خسر حلیل کا انتقال ہوا تو ان کی بصیرت اور صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر تمام قبائل نے قصیٰ کو خانہ کعبہ کی تولیت سونپ دی۔ (7) قصیٰ کے ہاں حلیل بن حبشیہ الخزاعی کی لڑکی حبّٰی سے شادی کے نتیجے میں چار فرزند پیدا ہوئے جن میں سے دو فرزندوں نے زیادہ شہرت پائی۔ ایک فرزند کا نام عبد مناف بن قصیٰ ہے ان کی نسل سے رسول اکرم ﷺ پیدا ہوئے اور دوسرے فرزند کا نام عبد العزیٰ بن قصیٰ ہے جن کی نسل سے اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبری پیدا ہوئی تھیں۔ (8)

قصیٰ نے اپنی ریاست قائم کرتے ہی خانہ کعبہ کی تعمیر نوء اور تزین وَآرائش کرائی اور خانہ کعبہ کے قریب اپنی رہائش کیلئے ایک عمارت بنوائی جب کہ اس سے ملحق ایک ہال بھی تعمیر کرایا جسے دار الندوہ کہا جات تھا۔ (9) قصیٰ نے ریاستی امور چلانے کے لئے مندرجہ ذیل قوانین رائج کیا اور تمام امور کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جس کی تفصیل مورخین نے اس طرح بیان کی ہے:۔ (10)

۱) حجابت (یعنی خانہ کعبہ کے انتظامی اور نگہبانی کے امور)
۲) سقّایہ (حج کے موقع پر حاجیوں کے لئے پینے کے پانی کا انتظام)
۳) رفادہ (حج کے موقع پر حاجیوں کے لئے کھانے کا انتظام)
۴) لواء (جنگ کی صورت میں علم جنگ بلند کرنا)
۵) ندوہ (مجلس شوریٰ ایوان حکومت)
۶) مکہ کی حکمرانی
۷) بیرونِ مکہ سے آنے والے حاجیوں سے محصول لینا۔

قصیٰ نے حکومت قائم کرتے ہی مکہ میں تیزی کے ساتھ ترقیاتی کام کرائے جس سے اہل مکہ کے دل قصیٰ کی طرف مائل ہوگئے اور قریش میں شامل تمام قبائل نے قصیٰ کو اپنا دینی اور دنیوی پیشواء مانتے ہوئے ان کی اطاعت کی اور قصیٰ کے بنائے گئے قوانین پر نا صرف ان کی زندگی میں عمل کیا بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی قریش کے تمام قبائل قصیٰ کے بنائے ہوئے قوانین پر دل جمی کے ساتھ عمل کرتے رہے۔ (11) قصیٰ ایک موحد اور دیندار شخص تھے ان کا ایک خطبہ اس بات کا مظہر ہے جو انہوں نے قریشِ مکہ کے سامنے دیا:۔

"یا معشر قریش انکم جیران اللہ، وأهل بیته، وأهل الحرم، وان الحاج ضیفان اللہ، وزوار بیته، وهم أحق الضیف بالکرامة، فاجعلوا لهم طعاماً وشراباً أیام الحج، حتی یصدروا عنکم، ففعلوا، فکانوا یخرجون۔" (12)

"اے جماعت قریش تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں ہو اور خدا کے گھر کے پڑوس میں رہتے ہو، تم اہل حرم ہو، حاجی اللہ تعالیٰ کے مہمان اور اس کے گھر کے زائر ہوتے ہیں اور وہ تمہارے مہمانوں سے زیادہ مستحقِ کرامت ہوتے ہیں لہٰذا تم ایام حج میں ان حجاج کے لئے اس وقت تک کھانے پینے کا انتظام کرو جب تک وہ تمہارے ہاں سے رخصت ہوں۔"

قریش نے قصیٰ کے اس خطبہ کو پسند کیا اور دین اسلام کے ظہور تک عطیات دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ (13) ۴۸۰ء میں قصیٰ کا انتقال ہوگیا تو ان کی تدفین بیرون مکہ حجون کے مقام پر ہوئی جو موجودہ دور میں مکہ شہر کی حدود میں داخل ہے۔ قریش ان کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے قافلوں کی شکل میں آتے تھے۔

(14) قصیٰ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مغیرہ جو تاریخ میں عبد مناف کے نام سے معروف ہیں، انہوں نے بھی اپنے والد کی طرح قریش پر حکومت کی اور قریش ان کے والد قصیٰ کی طرح ان کی بھی ویسی ہی اطاعت کرتے تھے۔(15)

عبد مناف نے عاتکہ کبریٰ بنت مرہ بن ہلال سے شادی کی جن سے ان کے ہاں چھ فرزند پیدا ہوئے۔(16) ان کے فرزندوں میں مُطّلب سب سے بڑے فرزند تھے۔ مُطّلب نے نجاشی کے ساتھ تجارتی معاہدہ کرکے قریش کے لئے اس کے ملک حبشہ میں تجارت کو آسان بنادیا تھا۔ دوسرے بیٹے عمرو جو تاریخ میں ہاشم کے نام سے معروف ہیں انہوں نے روم کے بادشاہ ہرقل کے ساتھ قریش کی روم اور شام میں محفوظ تجارت کرنے کا معاہدہ کیا۔

تیسرے فرزند عبد شمس بن عبد مناف ان کے متعلق مورخین کا کہنا ہے کہ یہ ہاشم کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ مورخین نے ان کے بارے میں بیان کیا ہے کہ ہاشم اور عبد شمس جس وقت پیدا ہوئے تو عبد شمس کے ہاتھ کی ایک انگلی ہاشم کے ماتھے سے جڑی ہوئی تھی جسے ان کے گھر کے افراد نے چھری سے جدا کیا اور کچھ لوگوں نے اس موقع پر یہ پیش گوئی کی کہ ان دونوں بھائیوں کی اولاد کے درمیاں خونریزی واقع ہوگی۔(17) چوتھے بیٹے نوفل بن عبد مناف تھے انہوں نے ایران کے کسریٰ سے قریش کے لیے ایران اور عراق میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی۔(18)

ہمارے مقالے کا موضوع عمرو (ہاشم) اور عبد شمس کی اولاد کی رقابت ہے اس لئے ہم یہاں صرف ان کی اولاد کے واقعات کو نقل کرینگے۔

عمرو کا لقب ہاشم اس لئے مشہور ہوا کہ ایک سال مکہ میں کھانے کی اشیاء کا قحط پڑ گیا تھا۔ عمرو یعنی ہاشم نے فوری طور پر مکہ سے شام کا سفر کیا جہاں جا کر اُنہوں نے لاتعداد نان پکوائے اور اونٹ خریدے جن پر نان بوریوں میں بھر کر لادے اور پھر انہیں مکہ معظّمہ لائے۔ عمرو (ہاشم) نے مکہ معظّمہ کے قصاب کو بلوایا اور ان سے تمام اونٹوں کو ذبح کرایا اور پھر باورچیوں کے ذریعے اس کا شوربے والا سالن تیار کرایا جس میں تمام نان تڑوا کر بھگو دیے گئے، عربی زبان میں ایسے کھانے کو ثرید کہا جاتا ہے۔ عمرو (ہاشم) نے اہلِ مکہ کو کھانا کھانے کی دعوت عام دی۔ اس سے پہلے مکہ معظّمہ میں ایسی بڑی اور پُر وقار دعوت کا کبھی اہتمام نہ ہوا تھا۔

لہٰذا ایسے کڑے وقت میں جب کہ مکہ معظّمہ میں قحط سالی تھی، اہل مکہ نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے بھرپور شرکت کی اور سب نے شکم سیر ہو کر یہ کھانا کھایا۔ اہل مکہ نے اس پُر وقار دعوت کا اہتمام کرنے پر عمرو کو ہاشم کا لقب دیا۔ عربی زبان میں ہشم کے لغوی معنی توڑنا اور ہاشم کا لفظ اسم فاعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اہلِ مکہ نے انہیں ہاشم کے نام سے پکارنا شروع کر دیا اور پھر آپ ہاشم کے نام سے معروف ہوگئے اسی نسبت سے ان کی اولاد کو ہاشمی کہا جانے لگا جو ان کے لیے باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ ہاشم کے اس کار خیر کو بارگاہ الٰہی میں بھی قبولیت حاصل ہوئی اور مکہ معظّمہ شہر میں خوب بارش ہوئی جس سے مکہ معظّمہ شہر کی خشک سال ختم ہو گئی اور قریش کے لیے تجارت کے اسباب پیدا ہوئے۔(19) اہل مکہ نے ہاشم کے اس عمل کو اہلِ مکہ کے لیے نیک شگون قرار دیا۔(20) ہاشم کی نیک نامی کا خوب چرچا ہوا اور ان کی سخاوت بہت مشہور ہو گئی۔ مُطّلب نے ہاشم کی اس نیک نامی کے سبب ہاشم کو خانہ کعبہ کی تولیت سونپ دی جس سے انکی عزت واحترام میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔(21)

عبد شمس کے غیر سنجیدہ ہونے کے باعث اسے نا تو کبھی کوئی منصب ملا اور نہ ہی قریش کے دلوں میں اس کے لیے عزت واحترام پیدا ہوا۔ عبد شمس نے قریش کی نظر میں اپنا کوئی مقام پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور کوئی قابل ذکر کام انجام نہ دیا بلکہ جاہلانہ روش کو اختیار کیا اور اپنے نیک نام بھائی سے محبت کرنے کی بجائے اپنے دل میں ان کے خلاف حسد کی آگ بھڑکائی اور عبد شمس ہاشم کی مخالفت میں کمربستہ ہوگیا۔ ہاشم نے اپنے ذمہ تمام فرائض کو فراخ دلی کے ساتھ بخوبی انجام دیا۔ ہاشم نے روم کے بادشاہ ہرقل کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ بھی کیا جسے تاریخ میں ایلاف کے نام سے شہرت ملی۔ ہاشم کے اس معاہدے یعنی "ایلاف" کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا اور سورہ قریش میں اس "ایلاف" کا ذکر کیا ہے۔(22)

ہاشم نے سال میں دو مرتبہ تجارتی سفر کا درج ذیل طریقہ کار متعارف کرایا۔

۱) موسم سرما میں گرم علاقوں میں تجارت کرنا جسے "رحلة الشتاء" کہا جاتا تھا۔

۲) موسم گرما میں سرد علاقوں میں تجارت کرنا جسے "رحلة الصيف" کہا جاتا تھا۔

اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے مکہ معظّمہ کے تاجروں نے سال میں دو مرتبہ تجارتی سفر کرنا شروع کیے۔ جس سے ان میں مالی خوشحالی آئی۔(23)

ایک طرف تو قریش کے دلوں میں ہاشم کی قدر و منزلت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف عبد شمس اور اُس کے بیٹے اُمیہ کے دلوں میں ہاشم سے پیدا ہونے والے بغض کے سبب حسد کی آگ اور زیادہ بھڑکنے لگی اور ان سے قریش کے دلوں میں ہاشم کی عزت و وقار دیکھنا گوارہ نہ ہوا اور جب برداشت ختم ہو گئی تو اُنہوں نے بھی قسم آزمائی کی اور ہاشم کی طرح اہل مکہ کے لئے ایک بڑی دعوتِ عام کا انتظام کیا جسے وہ قریش کے شایان شان منعقد نہ کر سکے۔

چونکہ یہ بے محل اور بے موقع دعوت عام فقط ہاشم کی برابری کرنے کی غرض سے تھی اس بات کو قریش سمجھ چکے تھے لہٰذا انہوں نے عبد شمس کی دعوتِ عام کا کھانا کھا کر عبد شمس اور اس کے بیٹے اُمیہ کا بہت مذاق اُڑایا جس سے عبد شمس اور اُمیّہ کے دلوں میں ہاشم کے خلاف حسد اور کینہ میں اضافہ ہو گیا۔ (24) عبد شمس کے بیٹے اُمیہ نے اپنی خجالت مٹانے کے لئے ہاشم کے مقابلے میں اپنی بڑائی منوانے کے لیے مفادرہ کرانے کا مطالبہ کیا۔ ہاشم نے اپنی بزرگی اور بردباری کے سبب مفادرہ ٹالنے کی کوشش کی لیکن اُمیّہ نے ہٹ دھرمی کا مظاہر کیا جب اُمیہ نہ مانا تو ہاشم نے مفادرہ ٹالنے کے لیے مندرجہ ذیل دو شرائط رکھیں تاکہ معاملہ ختم ہو جائے:۔(25)

ا) جو شخص ناکام ہوگا وہ پچاس سیاہ آنکھوں والی اونٹنیاں خانہ کعبہ کے سامنے ذبح کرائے گا۔

(۲) جو شخص ناکام ہوگا وہ دس سال کے لئے جلاوطن ہو کر مکہ معظّمہ سے باہر چلا جائے گا۔

اُمیہ نے اپنی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ضد میں ہاشم کی دونوں شرائط کو منظور کر لیا اور مفادرہ منعقد کرنے کے لیے ہاشم اور اُمیہ کی اتفاقِ رائے سے بنوء خزاعہ کے ایک شخص کو حکم مقرر کیا گیا۔ جس کے سامنے پہلے اُمیہ نے اپنی بزرگی بیان کی مگر اُمیہ اس حکم کو قائل کرنے میں ناکام رہا اس کے بعد ہاشم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بزرگی بیان کی جسے سُن کر حکم نے ہاشم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ مفادرہ میں ناکامی پر اُمیہ کو بہت طیش آیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔(26)

اُمیہ نے شرط کے مطابق پچاس سیاہ آنکھوں والی اونٹنیاں ہاشم کو ہر جانے کے طور پر دیں جنہیں ہاشم نے خانہ کعبہ کے سامنے ذبح کرا دیا اور اہل مکہ کی ایک بار پھر پُر وقار طریقہ سے ضیافت کی۔ دوسری شرط کے مطابق اُمیہ نے مکہ سے جلاوطنی اختیار کی اور شام چلا گیا۔ اُمیہ نے شام جا کر وہاں کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ وہاں مسیحی قوم کی اکثریت تھی جسے وہ ہاشم جیسے موحد شخص کی مخالفت میں اپنا ہم خیال بنا سکتا تھا وہ یہ دیکھ

کر خوش ہو گیا اور پھر وہاں اُس نے اپنے رفقاء کو منظّم کیا اور ہاشم کی اعلانیہ مخالفت شروع کر دی اور شام کو اپنا مرکز بنالیا۔(27)

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہاشم نے اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کے ساتھ شام کا تجارتی سفر کیا۔جب ہاشم اور ان کے ساتھیوں کا مدینہ کے علاقے سے گزر ہوا تو ان لوگوں نے مسافت کے تکان دور کرنے کی غرض سے مدینہ میں سوق النبط کے مقام پر قیام کیا، اس وقت مدینہ میں ایک سالانہ تجارتی نمائش لگی ہوئی تھی۔ ہاشم اس نمائش میں گئے اور کچھ اشیائے خرد و نوش خریدیں ،اُنہوں نے وہاں سلمیٰ نامی ایک خوبصورت اور سلیقہ شعار خاتون کو دیکھا۔ ہاشم نے وہاں کے لوگوں سے ان کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا ان کا تعلق مدینہ کے معزز قبیلہ سے ہے۔ ہاشم نے ان کے گھر جا کر سلمیٰ سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کے لیے اپنا رشتہ دیا۔ جسے اُن کے خاندان والوں نے ہاشم کی خاندانی وجاہت اور نیک نامی اور شہرت کے سبب منظور کر لیا اس طرح ہاشم اور سلمیٰ کی شادی ہو گئی۔ ہاشم نے کچھ روز مدینہ میں قیام کیا جس کے نتیجہ میں سلمیٰ حاملہ ہو گئیں۔ سسرال والوں نے خواہش ظاہر کی کہ وضع حمل تک ان کی بیٹی سلمٰی کو مکہ میں رہنے دیا

جسے ہاشم نے قبول کر لیا اور پھر ہاشم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سفر پر روانہ ہو گئے۔(28) ہاشم اس سفر میں بیمار ہو گئے اور غزہ کے مقام پر دورآن سفر ان کا انتقال ہو گیا۔ ہاشم کے دوستوں نے ان کی تدفین غزہ میں کر دی اور غمزدہ حالت میں مکہ معظّمہ پہنچے اور اس کا پورا احوال ان کے بھائی مُطّلب کو سنا دیا۔ ہاشم کے انتقال کی خبر سُن کر قریش غمزدہ ہو گئے اور پھر مُطّلب کو قوم کا سردار مقرر کر دیا گیا۔ مورخین نے اس اسے ۵۱۰ء کا واقعہ قرار دیا ہے۔(29)

دس سال گزر گئے ،حسب دستور مکہ کے تاجروں نے شام کا سفر کیا اور جب قافلہ مدینہ میں سوق النبط کے مقام پر ٹھیرا تو ان لوگوں نے وہاں ایک خوبصورت بچہ دیکھا جس نے تیر اندازی میں مہارت کے باعث ایک تیر اندازی کا مقابلہ جیتا اور خوشی کے عالم میں فخریہ انداز میں چیختے ہوئے کہا ! میرا نام شیبہ ہے اور میں ہاشم کا بیٹا ہوں۔ جب قافلے والوں نے یہ بات سنی تو خوشی میں انہوں نے اپنے تجارتی سفر کو مختصر کیا اور جلد ہی مکہ واپس پلٹے اور ہاشم کے بھائی مُطّلب کو اس بات کی اطلاع دی۔(30) مُطّلب کو جیسے ہی

اس بات کی اطلاع ملی اُنہوں نے کسی کو بھی بتائے بغیر خفیہ طور پر مدینہ کے سفر پر روانہ ہوئے اور سلمیٰ کے گھر کا پتہ معلوم کرکے اُن کے گھر پہنچے۔

اپنے بھتیجے شیبہ کی شکل و شباہت ہاشم کی طرح تھی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کی والدہ سلمیٰ سے ملاقات کے دورآن اُنہیں بتایا کہ شیبہ میرے بھائی ہاشم کا اکلوتا وارث ہے۔ مُطّلب نے ان کی ماں سلمیٰ سے اجازت سے لی اور شیبہ کو اپنے ساتھ مکہ لے آئے اور اُمیہ کی ہاشم سے دشمنی کے سبب کسی پر اس بات کو ظاہر نہ کیا۔ جس سے لوگ انہیں مُطّلب کا غلام سمجھے اور انہیں عبدالمُطّلب کہنے لگے ، لیکن ایک روایت میں ملتا ہے کہ مُطّلب شیبہ کو لے کر ظہر کے وقت مکہ پہنچے تو اہلِ قریش نے انہیں دیکھ کر کہا! ''ھذا عبد لمُطّلب'' (یہ مُطّلب کا غلام ہے)، اس پر مُطّلب نے فوری جواب میں کہا! نہیں یہ میرا بھتیجا ''شیبہ بن عمرو (ہاشم) ہے''اس جواب پر لوگوں کو تعجب ہوااور ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے ۔اسی دورآن وہ تاجر جنہوں نے مُطّلب کو شیبہ کی اطلاع دی تھی اُنہوں نے شیبہ کو دیکھ کر مُطّلب کی بات کی تصدیق کی اور سب نے کہا! ''ابنہ لعمری'' یہ عمرو کا بیٹا ہے۔اسی وجہ سے شیبہ عبدالمُطّلب کے نام سے معروف ہوگئے اور بالغ ہونے پر مُطّلب نے انہیں قریش کا سردار بنادیا۔(31)

عبدالمُطّلب کے سردار بن جانے کا جب اُمیہ کو علم ہوا تو اُس کے دل میں ہاشم سے بغض ہونے کے سبب اُن کے بیٹے عبدالمُطّلب سے بھی حسد پیدا ہوا اور اُمیہ کی جلاوطنی ختم ہونے اور اُس کی مکہ واپسی پر ہاشم کے بیٹے عبدالمُطّلب کے ہوتے ہوئے اسے کوئی اہمیت نہ ملنے یقین ہوگیا لہٰذا اُس نے عبدالمُطّلب کے خلاف اپنی مسلح جد و جہد کا اعلان کردیا۔

عبدالمُطّلب ایک بہادر اور دانشمند شخص تھے ، اُنہوں نے اُمیہ اور اس کے حواریوں کا مقابلے کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کی کمی محسوس کی تو اُنہوں نے خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے ہاں دس بیٹوں کی ولادت کے لئے منت مانی اور کہا ! اگر ان کے ہاں دس بیٹوں کی پیدائش ہوئی اور وہ جوان ہو کر ان کے قوتِ بازو بنے تو وہ ان دس بیٹوں میں سے ایک بیٹا خدا کی راہ میں خانہ کعبہ کے سامنے قربان کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور عبدالمُطّلب کے ہاں حسبِ خواہش دس بیٹے پیدا ہوئے۔ (32)

عبدالمُطّلب نے اپنے بیٹوں کو جوان ہونے پر اس منت کے بارے میں بتایا تو سب بیٹوں نے اپنے باپ کو منت پوری کرنے کیلئے فراخی کے ساتھ اپنے نام لکھ کر عبدالمُطّلب کو دیئے۔(33)

عبدالمُطّلب کی اولاد میں حضرت عبد اللہ سب سے چھوٹے تھے اور ان سے گھر والے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ جب قرعہ حضرت عبداللہ کے نام نکلا تو سب گھر والوں نے اسرار کیا کہ حضرت عبداللہ کے بدلے اونٹوں کی تعداد پر قرعہ اندازی کی جائے۔ عبدالمُطّلب نے اونٹوں کی تعداد پر قرعہ ڈالا، جب تین بار سو اونٹوں پر قرعہ نکلا تو عبدالمُطّلب نے خوشی خوشی سو اونٹ خانہ کعبہ کے سامنے قربان کئے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ عبدالمُطّلب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کی جان کے بدلے خانہ کعبہ کے سامنے سو اونٹ قربان کئے تھے۔(34)

عبدالمُطّلب کی بہادری اور ان کے بیٹوں کی کثرت کی وجہ سے تمام قبائل پر ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جب بھی کسی شخص کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وہ ان کے پاس آکر پناہ لیتا تھا اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا۔ اسی لئے عبدالمُطّلب کا گھر مظلوموں اور بیکسوں کی جائے پناہ کہا جاتا تھا۔ عبدالمُطّلب بلا تفریق لوگوں کی دادرسی کرتے اور ظالموں کو قانون کو سزا دیتے تھے۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلا ہے کہ زید بن کلاب (قصیٰ) کی قائم کردہ ریاست کے تمام اختیارات ان کے بعد ان کی باصلاحیت اولاد میں منتقل ہوتے گئے اور جب یہ اعزاز واختیار ہاشم کو منتقل ہوئے اور عبد شمس کی اولاد کو اس میں سے کوئی منصب نہ ملا تو عبد شمس کے بیٹے اُمیہ نے بغض و حسد میں ہاشم کے بیٹے عبدالمُطّلب سے انتقام لینے کی خواہش پیدا ہوئی اور اپنی جلاوطنی کے دوران اپنے بیٹے حرب کی مدد سے بنو ہاشم کے خلاف قبائل کو اپنا حلیف بنایا۔

بنو عدی اور بنو تیم بنو ہاشم کے دشمن تھے اس لئے وہ بھی اُمیہ کے حلیف بن گئے۔(35) بنو تیم کی بنو ہاشم سے دشمنی کا سبب ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں اس طرح پیش کیا ہے۔

عبد المُطّلب وجارہ الیھودی وکان لعبد المُطّلب جار یھودی یقال لہ أذینة ... فترك عبد المُطّلب منادمة حرب ونادم عبد اللہ بن جدعان التیمی وأخذ من حرب مائة ناقة فدفعھا الی ابن عم الیھودی وارتجع مالہ الا شیئا ھلك فغرمہ من مالہ۔(36)

عبدالمُطّلب کے پڑوس میں ایک مالدار یہودی تاجر جس کا نام اذینہ تھا رہائش پزیر تھا۔ حرب بن اُمیہ نے چند قریشی نوجوانوں کو اکسایا کہ اس کو قتل کرکے اس کے مال وَدولت پر قبضہ کرلیں۔ منصوبہ کے تحت عامر بن عبد مناف بن عبدالدار اور حضرت ابو بکر کے دادا صخر بن عمرو بن

کعب تیمی نے اس یہودی تاجر اذینہ کو قتل کر دیا اور عبد المُطّلب کے خوف سے حرب کے پاس جا کر روپوش ہوگئے جس کا عبد المُطّلب کو معلوم نہ ہو سکا۔ عبد المُطّلب قاتل کی تلاش میں رہے آخر کار ایک سال بعد انہیں پتہ چل گیا کہ دونوں قاتل حرب بن امیہ کی پناہ میں ہیں۔

عبد المُطّلب حرب بن امیہ کے گھر گئے اور دونوں قاتلوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ حرب نے دونوں کو چھپا دیا اس معاملہ پر دونوں میں تکرار ہوئی تو عبد المُطّلب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس گئے مگر اس نے مداخلت سے گریز کیا تو عبد المُطّلب نے اپنے بیٹوں کی مدد سے اس معاملہ کو انجام دینے کی ٹھانی جب معاملہ زیادہ بڑھا تو حرب نے کہا کہ اس معاملہ پر محاکمہ کرایا جائے۔

حضرت عمر بن خطاب کے دادا فضیل بن عبد العزیٰ عدوی کو حکم مقرر کیا گیا۔ فضیل بن عبد العزیٰ نے فیصلہ دیتے ہوئے حرب سے کہا! کیا؟ تو ایسے شخص سے محاکمہ چاہتا ہے جو تجھ سے قد میں لمبا ہے اور تجھ سے زیادہ خوش رو ہے اس کا سر تیرے سر سے زیادہ بڑا ہے، اس کی برائیاں تجھ سے کم ہیں، اولاد میں تجھ سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی سخاوت تجھ سے زیادہ ہے اور مدد کرنے میں تجھ سے زیادہ طاقتور ہے اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ تو یقیناً غصہ سے دور رہتا ہے اور تیری بلند آواز قوم میں سنی جاتی ہے اور تو قبیلے کے اتحاد میں طاقتور ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے باوجود تو نے جلاوطنی کا محاکمہ کرایا ہے کہ ان کو یا تجھے جلاوطن کیا جائے۔ حرب فضیل بن عبد العزیٰ کے فیصلے سے غضبناک ہوا اور کہا یہ انقلاب زمانہ ہے جو تجھے حکم بنایا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد عبد المُطّلب نے عبد اللہ بن جدعان تیمی کو اپنا مصاحب بنا لیا اور حرب سے سو اونٹ تاوان لے کر یہودی کے چچازاد بھائی کو دیئے اور یہودی کا سب مال جو باقی بچا تھا اس کے لواحقین کو دلا دیا اور جو مال ضائع ہو چکا تھا اس کا تاوان اپنے مال سے دیا۔

اس واقعہ سے جو صورت حال سامنے آئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنو تیم کی بنو ہاشم سے دشمنی کا اُمیہ کے بیٹے حرب کی سازش کا شاخسانہ تھا اور یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ یہ دشمنی حسد کی بناء پر پیدا ہوئی اور بنو اُمیہ کو احساس محرومی تھا۔ ہاشم اور عبد شمس کے حوالے سے کہی جانے والی یہ بات کہ پیدائش کے وقت ان کی پیشانی سے انگلی جدا کرنے کے دوران خون بہنے کی وجہ سے دشمنی پیدا ہوئی بالکل غلط ہے۔ ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب جمہرۃ الانساب میں بیان کیا ہے کہ پہلے عبد شمس پیدا ہوئے اور پھر ہاشم

پیدا ہوئے۔ (37) اس لئے اس مقام پر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ تاریخی اعتبار سے اُمیہ اور ہاشم کی دشمنی کا سبب بنو ہاشم کی نیک نامی اور ان کو حاصل اختیارات تھے جن کے حصول میں ناکامی نے بنو اُمیہ کو احساس محرومی کا شکار بنا دیا تھا اور کینہ پروری کی روش ہے جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بڑھتی گئی اور اُنہوں نے بنو ہاشم کے خلاف کسی بھی حد تک جانے سے گریز نہیں کیا۔

عبد المُطّلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی اپنے خاندان کی لڑکی حضرت آمنہ بنت وہب سے کر دی جن کا تعلق زُہرہ کی نسل سے تھا۔ (38) حضرت آمنہؑ کے بطن سے رسول اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی اور چھ ماہ بعد ان کے والد حضرت عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔ آپؐ کی پرورش آپ کے دادا عبد المُطّلب نے کی لیکن دو سال بعد اُن کا بھی انتقال ہو گیا جس کے بعد آپ ﷺ کے تمام چچا آپ کی کفالت حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن آپ ﷺ نے صرف اپنے چچا حضرت ابو طالبؑ کا انتخاب کیا۔ (39) حضرت ابو طالبؑ نے آخری دم تک آپ کی کفالت اور حفاظت کی۔

پیغمبر اکرم ﷺ کے اعلان نبوت کرتے ہی مشرکین مکہ آنحضرتؐ کے جانی دشمن ہو گئے۔ بنو اُمیہ جو عرصہ دراز سے بنو ہاشم کے روایتی حریف کا کردار ادا کر رہے تھے اب انہیں ایک بار پھر موقع مل گیا کہ وہ بنو ہاشم کے مخالف غیر موحد قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر بنو ہاشم کے خلاف ایک فیصلہ کن لڑائی لڑیں۔ اس لیے ابو سفیان بن حرب بن اُمیہ نے بنو ہاشم میں سے ابو لہب اور دیگر بت پرستی کی طرف مائل افراد کو اپنے ساتھ ملا لیا اور مکہ کے بت پرست قبائل کو پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ (40)

بنو اُمیہ کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ مذہبِ اسلام کی طرف راغب ہونے والے افراد پر سے ہمارا اثر رسوخ ختم ہو جائے گا۔ ابو سفیان نے قریش کے معروف افراد عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، عاص بن ہشام، ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل کو لے کر حضرت ابو طالبؑ کے پاس آئے اور رسول اکرم ﷺ کو دعوت اسلام دینے سے روکنے کا مطالبہ کیا اور یہ بھی دھمکی دی کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میدان جنگ میں اس بات کا فیصلہ ہوگا۔ یہ سُن کر رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابو طالبؑ نے رسول اکرم ﷺ کی بھرپور حمایت کی اور ان کی حفاظت کرنے کا آعادہ کیا۔ (41) رسول اکرم ﷺ کے اس مشن میں آپ کے چچازاد بھائی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے ان کا مکمل ساتھ دیا اور آپ کی پیروی بھی کی۔ جسے دیکھ کر مشرکین مکہ رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت ابو طالبؑ اور اُن کی اولاد کے بھی دشمن ہو گئے۔

جب مشرکین مکہ کے مظالم اسلام قبول کرنے والے افراد کیلئے ناقابل برداشت ہوگئے تو حضور اکرمؐ کی ہدایت پر مسلمانوں نے حبشہ ہجرت کی۔ (42) ان کے پیچھے ابو سفیان نے اپنا ایک وفد حبشہ بھیجا تاکہ وہاں سے مسلمانوں کو بے دخل کرائے، (43) جس میں اسے ناکامی ہوئی تومشرکین نے بنوء ہاشم کے خلاف ایک عہد نامہ تحریر کرکے خانہ کعبہ پر لٹکا دیا گیا جس کے تحت مشرکین مکہ نے بنوء ہاشم سے معاشرتی تعلقات کو منقطع کر دیا۔

ابو طالب بنوء ہاشم کو لے کر شعب ابی طالب منتقل ہوگئے تاکہ مشرکین کے شر سے محفوظ رہیں۔ بنوء ہاشم نے شعب ابی طالب میں تین سال قیام کیا اس دوران آنحضرت کی تبلیغ اسلام سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ (44) مشرکین کے عہد نامے کو مشیعت ایزدی سے دیمک نے کھالیا تو بنوء ہاشم شعب ابی طالب سے باہر آئے۔ (45) کچھ عرصہ بعد ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ انتقال کرگئے۔ رسول اکرمؐ کے لئے یہ ایک بڑا سانحہ تھا اس لئے انہوں نے اس سال کو عام الحزن قرار دیا۔ آنحضرتؐ کہا کرتے تھے! جب تک میرے چچا ابو طالبؑ زندہ رہے اہل مکہ کے حوصلے پست تھے وہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکے۔ (46) رسول اکرم کی تبلیغ سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جس سے خائف مشرکین نے پیغمبر اسلام پر جانوروں کی غلاظت پھینکنا شروع کردی اور آخری حربہ کے طور پر بنوء اُمیہ کے سردار ابو سفیان نے قریش کے مشرکین سرداروں کو دارلندوہ پر جمع کرکے منصوبہ بنایا کہ تمام قبائل کے نمائندہ افراد مل کر شب کی تاریکی میں قاتلانہ حملہ کرکے پیغمبر اسلام کا کام تمام کردیں گے چنانچہ اس منصوبے کے تحت مشرکین رات کے وقت آپ کے بیت الشرف کے باہر جمع ہوگئے۔ اسی رات حکم الٰہی سے رسول اکرمؐ نے اہل مکہ کی امانتیں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے سپرد کیں اور انہیں اپنے بستر پر لٹا کر یثرب کی طرف ہجرت کی۔ (47) اہل یثرب نے آپؐ کا والہانہ استقبال کیا اور یثرب کا نام تبدیل کرکے مدینۃ الرسول رکھ دیا جو بعد میں مدینہ منورہ کہلایا۔

مشرکین منصوبے میں ناکامی اور یثرب میں رسول اکرمؐ کے والہانہ استقبال کی خبر سن کر اہل یثرب کے بھی دشمن ہوگئے اور انہیں اس کا خمیازہ بھگتنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ ایک تجارتی سفر سے واپسی پر ابوسفیان نے مدینہ منورہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے خوف محسوس کیا تو ضمضم بن عمر نامی شخص کو اجرت دے کر مکہ بھیجا اور منادی کرادی کہ اہل مدینہ اس کا مال لوٹ لیں گے یہ سن کر مکہ سے مشرکین کی

ایک بڑی تعداد ابوسفیان کو بچانے کے لئے بدر کے مقام پر پہنچی اور ابو سفیان وہاں سے بحفاظت نکل گیا مگر مشرکین ابو جہل کے اسرار پر بدر کے مقام پر رک گئے اور اعلان کیا کہ تین دن تک رقص و سرور اور شراب نوشی کی محفلیں سجائیں گے اور اہل مدینہ کو خوف زدہ کریں گے۔(48)

رسول اکرمؐ کو مشرکین کے اس پروگرام کی خبر ہوئی تو آپؐ نے مسلمانوں کا ایک لشکر ترتیب دیا جس نے بدر کے مقام پر مشرکین مکہ سے ایک کامیاب جنگ لڑی اور مشرکین مکہ کو مار بھگایا اس واقعہ کے بعد جو لوگ مشرکین مکہ سے خوفزدہ تھے بے خوف و خطر دائرہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔(49) ابو سفیان نے جنگ بدر کا بدلہ لینے کیلئے مشرکین کو اکسایا اور ایک بڑا لشکر ترتیب دیا جو ۳ھ کو احد کے مقام پر پہنچا۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی جنگی حکمت عملی سے غفلت برتی جس کی بناء پر مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان ہوا اور اس جنگ میں رسول اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے۔ ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے حضرت حمزہ کا کلیجہ چیر کر جگر نکالا اور دانتوں سے چبا کر نگلنے کی کوشش کی۔(50) اس سے مشرکین کے حوصلے بلند ہوئے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی اور ۵ھ میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ جس کی پہلے سے اطلاع مل گئی تھی اور حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر مدینہ سے باہر کھودی گئی خندق کے مقام پر جنگ ہوئی جسے جنگ خندق اور جنگ احزاب کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالی نے اس جنگ کی صورتحال کو سورہ احزاب میں بیان کیا ہے۔(51) ۶ھ میں صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان ہوئی اور پیغمبر اکرمؐ نے سلاطین کو دعوت اسلام دی۔(52)

اسلام کی مقبولیت اور مسلمانوں کی پے در پے کامیابیوں سے خائف یہودی مسلمانوں کے خلاف خیبر میں ایک بڑی جنگ کی تیاری کرنے لگے اس اطلاع کے ملنے پر حضور اکرمؐ نے یہودیوں کا قلع کما کرنے کیلئے مسلمانوں کا لشکر ترتیب دیا اور خیبر پہنچے ۷ھ میں مسلمانوں کی خیبر کے یہودیوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے یہودیوں کے بڑے بڑے جنگی پہلوانوں کو قتل کیا اور خیبر فتح ہوا جس سے بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

مسلمانوں کی دھاک پورے عرب پر بیٹھ گئی اور حضرت علی بن ابی طالبؑ مسلمانوں کی طرف سے ایک عظیم شجاع کے طور پر پورے عرب میں مشہور ہوگئے۔(53) اس کے ساتھ ہی وہ لوگ دین اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ تھے اُنہیں مسلمانوں کے خلاف ایک اور جنگ کی تیاری کی جسے جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔

۷ھ میں جنگ موتہ ہوئی جس میں حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بڑے بھائی جعفر بن ابی طالبؑ شہید ہوئے اور انہیں رسول اکرم ﷺ نے جعفر طیارؑ کا لقب دیا۔ (54)

رسولِ اکرم ﷺ نے مشرکین مکہ کی جانب سے اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر آپ مکہ کی جانب روانہ ہوئے اور ۸ھ میں مکہ فتح ہوا جس کے بعد مشرکین مکہ کے لیے جانوں کے لالے پڑ گئے اور اپنی جان بچانے کی غرض سے انہوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ (55) رسولِ اکرم ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا جس کے بعد امویوں کی ایک بڑی تعداد ''طلقا'' کے نام سے معروف ہوئی اور بنو اُمیہ کی بنو ہاشم سے رقابت وقتی طور پر سرد مہری کا شکار ہو گئی۔!

تحقیق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بنو اُمیہ ہمیشہ سے بنو ہاشم کے خلاف صف آراء رہے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ کسی بھی طرح بنو ہاشم کو حاصل ہونے والی عزت و وقار کا خاتمہ کر دیں اور اُن کو ملنے والے تمام اعزازات جس میں مکہ کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کی تولیت بھی شامل تھی انہیں حاصل کر لیں۔ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی حیات میں اپنی مکاری سے حسب سابق کام لیا اور چُپ سادھ لی جس سے مورخین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بنو اُمیہ کی بنو ہاشم سے رقابت ختم ہو گئی تھی حالانکہ ایسا کچھ نہ تھا بلکہ اُموی ہاشمیوں پر اپنی کاری ضرب لگانے کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد اُموی ایک بار پھر سرگرم ہوگئے اور بالآخر اپنی مکاری اور چالبازی کے بل بوتے پر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ان مظالم کی داستان بنو ہاشم کے خون سے تاریخ کے اوراق پر رقم ہوئی

حوالہ جات

1۔ابن سعد، محمد بن منیع ابو عبد اللہ البصری الزہری، الطبقات الکبریٰ، ناشر دار صادر، بیروت، ج۱، ص۶۷؛ ابن اثیر، محمد بن محمد، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت ۱۹۶۶ء، ج۲، ص۱۸؛ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، مطبوعہ موسسۃ الاعلمی، بیروت ۱۸۷۹ھ، ج۲، ص۲۵۴؛ ابن خلدون، عبدالرحمٰن ابن خلدون المغربی،

کتاب العبر ودیوان المبتداوالخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر، مطبعۃ موسسۃ الاعلمی، بیروت ۱۹۷۱ء، ج ۲، ص ۲۹۱

2۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۶۷؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ۱۹؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۵۵، ۲۵۴

3۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۶۷؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۹؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۲۹۷ اردو؛ تاریخ طبری۔ ج ۲ ص ۲۵۵

4۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۸۶؛ تاریخ ابن خلدون (ج ۲ ص ۳۰۲) اردو ترجمہ مطبوعہ نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔

5۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۶۹؛ تاریخ الطبری، ج ۲، ص ۲۵۵؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۱

6۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۰؛ ، تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۹ اردو ترجمہ؛ تاریخ طبری (ج ۲ ص ۳۴) اردو ترجمہ مطبوعہ نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔ الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۲۵۷) الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۶۸

7۔ الکامل فی التاریخ۔ ابن اثیر۔ ج ۲ ص ۱۹؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۸؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۵۵

8۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۳۱؛ تاریخ ابن خلدون (ج ۲ ص ۲۹۷) اردو ترجمہ؛ تاریخ ابن اثیر ج ۲، ص ۲۲؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۵۵، ۲۵۴،

9۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۰؛ تاریخ ابن اثیر ج ۲، ص ۲۶، تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۹؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۶

10۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۰؛ تاریخ طبری، ج ۲ ص ۳۵ اردو ترجمہ؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۱

11۔ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۱

12۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۳؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۹؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۶؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۲

13۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۳،؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۹؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۶؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۱

14۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۳؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۲۹؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۵؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۹

15۔ الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۷۴؛ تاریخ ابن خلدون ج ۲، ص ۲۲۹،

16۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۵

17۔ تاریخ طبری، ج ۲ ص ۳۱؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۶
18۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۵
19۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۶؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۱؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۶
20۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۶
21۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۸؛ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۳۱ اردو ترجمہ
22۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۵؛ سورۃ القریش ۱۰۶ قران مجید۔
23۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۵
24۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۶؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۷
25۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۶؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲ ص؛ تاریخ ابن خلدون (ج ۲ ص ۳۰۰) اردو ترجمہ
26۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۶؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۷
27۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۷۶، ؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۷
28۔ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۰؛ علل الشرایع شیخ صدوق ص ۱۸۶ اردو ترجمہ مطبوعہ الکساء پبلیکیشنز کراچی
29۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۸۰، ؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۱، ۱۰
30۔ الطبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۸۰؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۱

31۔ الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۸۱، المؤلف: محمد بن سعد بن منیع أبو عبد اللہ البصری الزہری، الناشر: دار صادر- بیروت؛ الکامل فی التاریخ۔ ابن

32۔ الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۸۴؛ ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد اندلیسی، جمہرۃ انساب العرب، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ط۔ ۲۰۰۳ء، ج ۱، ص ۶۔ ۵؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۵
33۔ الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۸۴؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۳۰۰) اردو؛ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۶؛ تاریخ طبری (ج ۲ ص ۳۲) اردو
34۔ الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۸؛ الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۸۹؛ سیرۃ الحلبیہ ج ۱، ص ۲۷ مطبوعہ بیروت دار لمع رفہ ۔ السیرۃ النبویہ والاثارُ المحمدیہ (علامہ سید احمد زینی دحلان مکی) سیرت دحلانیہ ص ۹۴ اردو ترجمہ۔ علامہ صائم چشتی)۔
35۔ سیرت دحلانیہ علامہ سید احمد زینی دحلان مکی اردو ترجمہ صائم چشتی ص ۹۴ مطبوعہ چشتی کتب خانہ

فیصل آباد

36۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۵، ؛ تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۳۰۰) اردو؛ تاریخ طبری (ج ۲ ص ۲۷) اردو

37۔جمھرۃ انساب العرب، ص ۱۴ تالیف ابی محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الاندلیسی (متوفی۔۴۵۶ھ)، مطبعۃ دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان۔

38۔الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۸۶ ؛الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۸ ؛تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۳۰۳) اردو

39۔الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۱۱۹ ؛الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۳۷

40۔تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۳۰۲، اردو؛تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۶) اردو

41۔الطبقات الکبری، ج ۱، ص ۲۰۲ ؛۔تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۲۹۱) اردو

42۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۷۶ ؛تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۷۴

43۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۷۹

44۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۸۷ ؛تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۷۴

45۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۹۰

46۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۹۰

47۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۰۳ ؛، تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۸۴

48۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۱۶

49۔الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۱۱۶

50۔تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۱۱۴؛ محمد بن علی بن طباطبا المعروف بابن الطقطقی (م ۷۰۹)، الفخری فی الآداب السلطانیۃ و الدول الاسلامیۃ،، تحقیق عبد القادر محمد مایو، ناشر دار القلم العربی، ، بیروت، طبعہ اولی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۹، ۱۱۰

51۔سورہ احزاب قران مجید

52۔تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۱۳۹

53۔تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۱۴۸

54۔تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۱۵۱

55۔تاریخ ابن خلدون، ج ۳، ص ۱۵۶، تاریخ الامم والملوک، ج ۲، ص ۶۱۸؛ مودودی، سید ابو الاعلیٰ، خلافت و ملوکیت، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور، ص ۸۴

اہلِ قبلہ کی حرمتِ تکفیر کتاب وسنت کی نظر میں

سید مزمل حسین نقوی*

کلیدی کلمات: اتحاد واتفاق،اہل قبلہ ،مومن ،امام جعفر صادق ،امام شافعی ،امام ابوحنیفہ، ابن تیمیہ۔

خلاصہ

اسلام نے باہمی روابط کے استحکام اور اجتماعی زندگی کو ایک عظیم نعمت قرار دیا ہے۔قرآن کی نظر میں اتفاق ایک نعمت اور انتشار و پراکندگی ایک عذاب ہے۔تاریخ اسلام کا یہ سیاہ ورق ہے کہ باہمی اختلاف کی بدولت سقوط بغداد کا المناک سانحہ پیش آیا اور جس کی وجہ سے امت مسلمہ کو بہت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔اس فرقہ پرستی کی لعنت نے مسلمانوں کو کئی دہائیاں پیچھے دھکیل دیا۔قرآن کے مطابق مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔رسول خداؐ کا فرمان ہے :اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر نہ ظلم کرتا ہے نہ اسے دھوکا دیتا ہے اور نہ اس کی اہانت کرتا ہے۔اسی طرح امام صادقؑ فرماتے ہیں: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس کی آنکھ اور اس کے لیے آئینہ و راہنما ہے۔وہ اس سے خیانت نہیں کرتا،اس پر ظلم نہیں کرتا،اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور اس کی غیبت نہیں کرتا۔اسلامی معاشرے میں اتحاد واتفاق کی فضا اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب ہمارا مطمح نظر مادیت کے بجائے روحانیت اور حصول دنیا کے بجائے دین کی ترویج ہو۔مومن کون ہے؟قرآن اور روایات کی رو سے ایمان اور اسلام کا معیار کیا ہے؟جو معیار و میزان قرآن وسنت نے بیان کیا ہے اگر کوئی اس پر پورا اترتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔کسی اور عمل کی وجہ سے اسے کافر کہنا غلط ہے۔یہاں ہم وہ معیار بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔اس مقالے میں اسی معیار کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔لہٰذا مسلمان کو کافر کہنا جائز نہیں ہے جیسا کہ حضرت ابو حنیفہ اور امام شافعی نے بھی کہا ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی کافر نہیں کہا جاسکتا۔بلکہ کسی کو کافر کہنا ہی حقیقت میں کلمہ کفر ہے۔

---

*۔ڈائریکٹر ریسرچ،البصیرہ ٹرسٹ،اسلام آباد

مقدمہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات اور مل جل کر رہنے کی جتنی تاکید اسلام نے کی ہے کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ باہمی روابط کے استحکام اور اجتماعی زندگی کو ایک عظیم نعمت قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں خداوند کریم فرماتا ہے:

"وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔" (1)

ترجمہ: "اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کر دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم جہنم کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں نکال لیا اور اللہ اسی طرح اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔"

ایک اور مقام پر تو خدا نے اسے ایک معجزے کے طور پر بیان کیا ہے۔ فرماتا ہے:

"وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔" (2)

ترجمہ: "اور ان کے دلوں میں محبت پیدا کر دی ہے۔ اگر آپ روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی ہے یقیناً وہ ہر شے پر غالب اور صاحب حکمت ہے۔"

اتفاق کو نعمت اور انتشار و پراکندگی کو عذاب قرار دیتا ہے۔ قرآن میں خداوند کریم فرماتا ہے:

"قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ۔" (3)

ترجمہ: ''کہہ دیجیے کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ تمھارے اوپر سے یا تمھارے قدموں کے نیچے سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے یا تمھیں فرقوں میں الجھا کر ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیات کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔''

اس آیت میں رسول خداﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ مجرموں کو تین طرح کے عذاب سے ڈرائیں۔ وہ عذاب جو آسمان سے نازل ہوتا ہے جس طرح آسمانی بجلی کا گرنا تیز بارش کا آنا جس طرح قوم نوح پر آئی تھی۔ دوسرا عذاب جو زمین کی طرف سے ہوتا ہے مثلاً زلزلہ طوفان وغیرہ اور تیسرا عذاب باہمی اختلاف اور فرقوں میں بٹ جانا۔

اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ اختلاف اس قدر خطرناک ہے کہ اسے صاعقہ یعنی آسمانی کڑک اور زلزلے جیسے ہولناک عذابوں کے ساتھ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض اوقات اختلافات کی وجہ سے اس قدر قتل و غارت ہوئی اور بستی کی بستیاں ویران ہو گئیں ہیں کہ اس قدر اموات تو زلزلے اور آسمانی عذاب سے بھی نہیں ہوئیں۔ مذکورہ آیت کی تفسیر میں پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے احکام سے سرتابی کرکے انسان امن و عافیت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کبھی اوپر سے بجلی کڑک رہی ہے۔ موسلا دھار بارشیں سیلاب کی صورت اختیار کرکے قیامت ڈھا رہی ہیں۔ کہیں زلزلے آباد شہروں کو کھنڈرات میں بدل رہے ہیں لیکن اس کے علاوہ سخت تر عذاب یہ ہے کہ آپس میں انتشار اور بے اتفاقی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔ ایک قوم کے فرزند اور ایک ملت کے افراد مختلف ٹولیوں اور فرقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ کہیں مذہب وجہ فساد بن جاتا ہے اور کہیں سیاست باعث انتشار۔ اپنوں کی عزت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دینا بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ اوروں کو رہنے دیجئے اپنے گھروں کا حال دیکھئے۔ جب سے ہم نے صراط مستقیم سے انحراف کیا ہے ہم کن پستیوں میں دھکیل دیے گئے ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک کعبہ پر ایمان رکھنے والے کس نفاق اور انتشار کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال زار پر رحم فرمائے۔ آمین۔'' (4)

تاریخ اسلام کے اس سیاہ ورق سے کون آشنا نہیں ہے کہ جب شیعہ و سنی اختلاف کی بدولت سقوط بغداد کا المناک سانحہ پیش آیا۔ یہ اختلاف اس قدر بڑھ گئے تھے کہ بعض افراد نے ہلاکو خان کو بغداد پر چڑھائی کی

دعوت دی۔ اس نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اہل بغداد پر جو مظالم ڈھائے اور جو سفاکی کی اور جو غارت گری اور خون ریزی روا رکھی اس کی داستان انتہائی المناک ہے۔ بغداد جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور مذہبی دنیا کا عظیم ترین شہر تھا کھنڈرات کا ڈھیر بن گیا۔ صدیوں کے محفوظ علمی اور فنی ذخائر یا تو جلا دیے گئے یا دریا برد کر دیے گئے اور یوں تمدنی ترقی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

آزاد دائرۃ المعارف کے مطابق اس حملے میں ایک لاکھ مسلمان مارے گئے تھے۔ شہر جلا دیا گیا تھا یہاں تک کہ بغداد کے کتب خانے بھی چنگیزی افواج کے حملے سے محفوظ نہیں رہے۔ بیت الحکمۃ جو کہ بے شمار قیمتی تاریخی دستاویزات اور طب سے لے کر علم فلکیات تک کے موضوعات پر لکھی گئی کتب کا گھر تھا کو تباہ کر دیا گیا۔ عینی شاہدین کے مطابق دریائے دجلہ کا پانی ان کتب کی سیاہی سے سیاہ پڑ گیا جو بہت زیادہ دریا میں پھینک دی گئی تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی دنوں تک اس کا پانی سائنسدانوں اور فلسفیوں کے خون سے سرخ رہا۔ وصاف کا دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی کا نقصان کئی لاکھ تھا۔(5)

اس طرح باہمی اختلافات کی وجہ سے امت مسلمہ کو بہت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اس فرقہ پرستی کی لعنت نے مسلمانوں کو کئی دہائیاں پیچھے دھکیل دیا۔ اسی لیے خدا اور اس کے رسول نے ہمیشہ اتحاد و اتفاق اور اخوت و بھائی چارے پر زور دیا ہے۔

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔"(6)

ترجمہ: "یقیناً مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

رسول خداﷺ فرماتے ہیں: "کونوا عباد اللہ اخواناً المسلم اخوالمسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحقرہ۔"(7) یعنی "اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر نہ ظلم کرتا ہے نہ اسے دھوکا دیتا ہے اور نہ اس کی اہانت کرتا ہے۔"

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "المسلم اخوا لمسلم ھوعینہ و مرآتہ ودلیلہ لا یخونہ ولا یخدعہ و لا یظلمہ ولا یکذبہ ولا یغتابہ۔"(8) یعنی "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس کی آنکھ اور اس کے لیے آئینہ و راہنما ہے۔ وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، اس پر ظلم نہیں کرتا، اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور اس کی غیبت نہیں کرتا۔"

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اتحاد و اتفاق باعث خیر و برکت اور اجتماعی عروج و ارتقاء کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ جبکہ افتراق و انتشار تباہی و بربادی اور غربت و افلاس کا پیش خیمہ ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دور میں وہی قومیں اپنی عظمت و سطوت کے پرچم لہراتی رہی ہیں۔ جنھوں نے باہمی بغض و عناد اور اختلاف و انتشار سے دور رہ کر اپنی پوری توانائی ملی اور معاشرتی اصلاح کے لیے خرچ کی۔ اس کے برعکس وہ قومیں جو خانہ جنگی کا شکار ہو کر الگ الگ گروہوں میں بٹ گئیں انھیں زندگی کے ہر شعبے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

عالمی منظر نامے میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کسی بھی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مسلمان معاشیات، اقتصادیات، سیاست سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں دوسری اقوام سے پیچھے ہیں۔ باہمی اختلافات نے انھیں کھوکھلا کر رکھا ہے۔ تمام تر معدنی ذخائر رکھتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں دوسروں کے دست گھر بنے ہوئے ہیں۔

اسلام دشمن عناصر اس وقت اپنی پوری قوت و طاقت اس مقصد پر صرف کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد کو ہر صورت میں روکا جائے اور انھیں مسلکی اور مشربی مسائل میں اس طرح الجھا دیا جائے کہ انھیں ان کے حل کا موقع ہی نہ مل سکے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ وقتاً فوقتاً نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں اور مسلمان انھیں سمجھے بغیر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی تشویق ناک صورت حال سے نمٹنے کے لیے باہمی مذاکرات اور افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ قرآنی اور اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسلام نے ہر موڑ پر فرد پر جماعت کو ترجیح دی ہے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو باعث فتح و نصرت قرار دیا ہے۔ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں:

"فان ید اللہ علی الجماعۃ و ان الشیطان مع من فارق الجماعۃ۔" (9)

یعنی "اللہ کا ید رحمت جماعت کے سر پر ہوتا ہے اور اس کا ساتھی شیطان ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہو جائے۔"

ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا: "ایھا الناس علیکم بالجماعۃ و ایاکم و الفرقۃ۔" (10)

یعنی "اے لوگو! متحد رہو اور تفرقہ سے بچو۔"

اسلامی معاشرے میں اتحاد و اتفاق کی فضا اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب ہمارا مطمح نظر مادیت کے بجائے روحانیت اور حصول دنیا کے بجائے دین کی ترویج ہو۔ باہمی بغض و عناد اور بے جا مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہو کر ہم ایمانی رشتہ اخوت کے بندھن میں بندھ جائیں اور ایک دوسرے کے متعلق اپنے دل میں درد مندانہ جذبہ پیدا کریں لیکن آج حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہو چکے ہیں۔ خلوص و للھیت ختم ہو چکی ہے۔ ذاتی مفاد کی خاطر امت کا بڑے سے بڑا نقصان بھی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیا جاتا ہے۔ بعض جاہ طلب افراد دنیا طلبی کی خاطر ہمیشہ مذہبی اختلافات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ انھیں امت مسلمہ کا اتفاق ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اختلاف و انتشار کی آگ بھڑکانے کے لیے اپنی ذہنی و فکری توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کے درمیان نظریاتی اختلاف موجود ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر فرقہ اپنے اپنے نظریے اور عقیدے پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ خود کو برحق اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے۔ نظریوں کا یہ اختلاف اپنی جگہ لیکن اس کی وجہ سے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ وہ شخص جو خود کو مسلمان کہتا ہے۔ خدا کی وحدانیت اور خاتم النبیین کی گواہی دیتا ہے اگر اس کا کوئی نظریہ ہمارے نظریے سے نہیں ملتا۔ اس کے بعض عقائد ہمارے عقائد سے نہیں ملتے تو اسے ہم اسلام سے خارج نہیں کر سکتے۔ اسے لاعلم اور جاہل تو کہہ سکتے ہیں لیکن کافر نہیں کہہ سکتے۔ خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔" (11)

ترجمہ: "اور جو تم پر سلام کرے اسے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔"

اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے چوتھی صدی کے مشہور مفسر جصاص کہتے ہیں:

"مسلمانوں کو رسول خدا ﷺ نے ایک جنگ کی طرف بھیجا۔ راستے میں انھیں ایک شخص نظر آیا۔ اس کے پاس بہت سارا مال تھا۔ اس نے ان پر سلام کیا اور کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لیکن محلم بن جثامہ نے اسے قتل کر دیا۔ جب وہ واپس آئے اور رسول خدا ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے فرمایا اسے کیوں قتل کیا ہے جبکہ وہ اسلام لا چکا تھا۔ محلم نے کہا اس نے قتل کے ڈر سے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ فرمایا تم نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھا تھا۔ پھر آپؐ نے اس کے وارثین کو دیت ادا کی اور اس کا تمام مال بھی اس کے ورثا کو واپس کر دیا۔" (12)

اس آیت کے ذیل میں مشہور مفسر شوکانی کہتے ہیں:

"یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو کسی کافر کو لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد قتل کرے گا وہ گناہ قتل کا مرتکب ہوگا کیونکہ یہ جملہ کہنے سے اس کی جان، مال اور اہل و عیال محفوظ ہو گئے ہیں۔ چونکہ رسول خداﷺ کے دور میں ایسا ہو چکا ہے۔ آنحضرتﷺ نے ایسے شخص کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ جو قتل کے خوف سے کلمہ پڑھ لے وہ مسلمان نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کا خون قابل احترام قرار پاتا ہے، مسلمان اسی وقت ہوگا جب وہ کسی خوف و ڈر کے بغیر کلمہ پڑھے جبکہ آنحضرتﷺ نے ہر کلمہ پڑھنے والے کو مسلمان قرار دیا ہے۔ اقرار اور تسلیم بھی کلمہ کے حکم میں ہے، مثلاً اگر وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں یا یہ کہتا ہے کہ تمھارے دین پر ہوں تو اسے مسلمان سمجھا جائے گا۔" (13)

مومن کون ہے؟ قرآن اور روایات کی رو سے ایمان اور اسلام کا معیار کیا ہے؟ جو معیار و میزان قرآن و سنت نے بیان کیا ہے اگر کوئی اس پر پورا اترتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے۔ کسی اور عمل کی وجہ سے اسے کافر کہنا غلط ہے۔ یہاں ہم وہ معیار بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

مومن از نظر قرآن

سورہ بقرہ میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

۱۔ "وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ۔" (14)

ترجمہ: "اور مومن وہ ہیں جو اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔"

۲۔ "وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ۔" (15)

ترجمہ: "بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو بھی اللہ، روز آخرت، فرشتوں، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔۔۔"

۳۔ "ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔" (16)

ترجمہ: "یہ نصیحت اس کے لیے ہے جو تم میں سے اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔"

۴۔ ”اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔“ (17)

ترجمہ: ”یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں پھر شک نہ کریں اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کریں، حقیقتاً یہی لوگ سچے ہیں۔“

اسلام اور ایمان از نظر روایات

۱۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول خداﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا اسلام کیا ہے؟ فرمایا: ”شهادة ان لا اله الا الله و ان محمداً رسول الله و تقيم الصلاة و تؤتى الزكاة و تصوم رمضان و تحج البيت۔“ یعنی: ”خدا کی وحدانیت اور محمد کی رسالت کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکات دینا، روزہ رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔“ اس نے پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ”ان تومن بالله و ملائكته والجنة والنار والبعث بعد الموت والقدر۔“ (18) یعنی: ”کہ تو اللہ، اس کے ملائکہ، جنت، جہنم، موت کے بعد زندہ ہونے اور قضا و قدر پر ایمان لے آئے۔“

۲۔ جب رسول خداﷺ حضرت علی علیہ السلام کو جنگ خیبر میں مرحب کے مقابلے میں بھیجنے لگے تو آپؐ نے آنحضرتﷺ سے پوچھا کب تک جنگ کروں تو فرمایا:

”قاتلهم حتى يشهد ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله فاذا فعلوا ذلك فقد منعوا منك دمائهم و اموالهم الا بحقها وحسابهم على الله۔“ (19)

یعنی ”ان سے جنگ کرنا یہاں تک کہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمد کی رسالت کی گواہی دے دیں۔ جب وہ کلمہ پڑھ لیں تو پھر ان کا خون اور ان کا مال محفوظ ہے مگر جہاں حق ہو اور ان کا حساب خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

۳۔ عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول خداﷺ نے فرمایا:

”امرت ان اقاتل الناس حتى ... الا بحق الاسلام وحسابهم على الله۔“ (20)

یعنی ”مجھے لوگوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمدﷺ کی رسالت کی گواہی دے دیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ جب وہ اس طرح کریں گے تو میری

طرف سے ان کی جان اور اموال محفوظ ہیں مگر حق اسلام کی خاطر اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔"

۴۔ عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول خداﷺ نے فرمایا:

"بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله و ان محمداً رسول الله و اقام الصلاة وایتاء الزکاة والحج و صوم رمضان۔" (21) یعنی "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔لا اله الا الله اور محمد رسول اللہ کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا، حج کرنا اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا۔"

مذکورہ بالا آیات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص خدا کی وحدانیت ، آنحضرتﷺ کی رسالت، قیامت، ملائکہ اور گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا قائل ہو جاتا ہے۔ نیز نماز ، روزہ، حج اور زکوۃ کے وجوب کو تسلیم کرلیتا ہے وہ در حقیقت دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان اور مومن ہے۔اس پر اسلام کے تمام احکام جاری ہوں گے۔ اگرچہ وہ نماز و روزہ اور حج و زکوۃ کا پابند نہیں ہے یعنی ان کے وجوب کا قائل ہے لیکن بجا نہیں لاتا۔ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اگرچہ فاسق اور گناہگار ہے۔اس کی جان و مال اور عزت و آبرو قابل احترام ہیں۔

ایسے شخص کو کافر کہنا سنگین جرم ہے۔ خدا اور اس کے رسولﷺ نے تو مسلمان کی غیبت کرنے اور اس پر بہتان باندھنے سے منع کیا ہے۔ چہ جائیکہ اسے کافر کہنا، آنحضرتﷺ فرماتے ہیں:

"المسلم علی المسلم حرام دمه و عرضه و ماله۔" (22)

یعنی" مسلمان کا ایک دوسرے پر خون، عزت اور مال حرام ہے۔"

خوارج نے جب حضرت علی علیہ السلام کے ساتھیوں کو کافر کہنا شروع کیا تو آپﷺ نے انھیں مخاطب کرکے فرمایا:

"تم جانتے ہو کہ رسول خداﷺ نے جب زانی کو سنگسار کیا تو اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی اور اس کے وارثوں کو اس کا ورثہ بھی دلوایا۔ قاتل سے قصاص لیا تو اس کی میراث اس کے گھر والوں کو دلائی، چور کے ہاتھ کاٹے اور زنا غیر محصنہ کے مرتکب کو تازیانے لگوائے تو اس کے ساتھ انھیں مال غنیمت میں سے حصہ بھی دیا۔ انھوں نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسلمان عورتوں سے نکاح بھی کیے۔ اس طرح رسول خداﷺ نے ان کے گناہوں کی سزا انھیں دی اور جو ان کے

متعلق اللہ کا حق تھا اسے جاری بھی کیا۔ مگر انھیں اسلام کے حق سے محروم نہیں کیا اور نہ اہل اسلام سے ان کے نام خارج کیے۔ تم ہو ہی شر پسند اور وہی ہو جنھیں شیطان نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آلہ کار بنا رکھا ہے اور اس طرح گمراہی کے سنسان بیابان میں لا پھینکا ہے۔" (23)

سورہ حجرات ۱۰ تا ۱۲ میں خدا فرماتا ہے:

"مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اے ایمان والو کوئی گروہ کسی گروہ کا مذاق نہ اڑائے اور نہ ہی عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں چونکہ ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد نہ کرو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام لینا فسق ہے اور جو توبہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو، بہت سی بدگمانیوں سے بچو بعض بدگمانیاں یقیناً گناہ ہیں اور تجسّس بھی نہ کرو اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ یقیناً تم اس سے نفرت کرتے ہو۔"

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من روی علی مومن روایۃ یرید بھا شینہ و ھدم مروئتہ لیسقط من اعین الناس اخرجہ اللہ من ولایتہ الی ولایۃ الشیطان فلا یقبلہ الشیطان۔" (24)

یعنی "جو کسی مومن کی آبرو ریزی اور عیب جوئی کی خاطر کوئی بات کرے تاکہ اسے لوگوں کی نظروں سے گرادے تو خدا اسے اپنی ولایت سے نکال کر شیطان کی ولایت کی طرف دھکیل دیتا ہے لیکن شیطان بھی اسے قبول نہیں کرتا۔"

مومن پر تہمت لگانا

تہمت یعنی کسی کے متعلق ایسی بات کہنا جو اس میں نہ ہو، اسلام نے اس سے سختی سے منع کیا ہے، اسے گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے اور اس پر جہنم کی سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"من بھت مومنا او مومنۃ او قال فیہ مالیس فیہ اقامہ اللہ عزوجل یوم القیامۃ علی تل من نار حتی یخرج مما قال فیہ۔" (25)

یعنی ''جو کسی مومن یا مومنہ پر بہتان تراشی کرے یا اس کے بارے میں ایسی بات کہے جو اس میں نہیں ہے تو قیامت کے دن خدا اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کر دے گا یہاں تک کہ اپنی کہی ہوئی بات سے دستبردار ہو جائے۔''

اسی بہتان کے متعلق امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ''البهتان على البرئ اثقل من الجبال الراسيات۔'' (26) یعنی ''کسی بے گناہ پر الزام تراشی مضبوط پہاڑوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔''

مومن کو گالی دینا

مومن کی اہانت کرنا گناہان کبیرہ میں سے ہے۔ گالی گلوچ کے ذریعے ہو، مذاق اڑانے کی شکل میں ہو۔ برے القاب کی صورت میں ہو۔ بہرحال مومن کی اہانت جس شکل میں بھی ہو خدا اور اس کے رسول نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ قرآن کریم میں خداوند کریم ارشاد فرماتا ہے:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔'' (27)

ترجمہ: ''اے ایمان والو کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگایا کرو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام لینا انتہائی نا مناسب ہے اور جو توبہ نہیں کریں گے یقیناً وہی ظالم ہیں۔''

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''سباب المؤمن فسق وقتاله كفر۔'' (28) یعنی ''مومن کو گالی دینا فسق اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔'' ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: ''لعن المومن كقتله و من قتل نفسه بشئ فى الدنيا عذب به يوم القيامة۔'' (29) یعنی ''مومن پر لعنت اسے قتل کرنے کے مترادف ہے اور جو کسی کو دنیا میں جس شے سے قتل کرے گا قیامت کے دن اسی شے سے اسے عذاب دیا جائے گا۔''

مومن کو کافر کہنا

مذکورہ بالا آیات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول ﷺ کی نظر میں مومن کا بہت بڑا مقام ہے۔ اسلام اس کی حرمت کا قائل ہے۔ کسی صورت میں اس کی اہانت برداشت نہیں کرتا۔ اس کی اہانت کرنے والے اور اسے تکلیف پہنچانے والے کی سخت مذمت کی ہے اور اسے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔ خصوصاً جو کسی مسلمان اور اہل ایمان کو کافر کہتا ہے خدا اور رسول ﷺ نے سخت الفاظ میں اس کی سرزنش کی ہے اور خود اس کے اسلام کو مشکوک قرار دیا ہے۔ رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں:

"ایما رجل مسلم أکفر رجلا مسلما فان کان کافراً والا کان ھو الکافر۔" (30)

یعنی "جو بھی مسلمان کسی مسلمان کو کافر کہے گا اگر وہ کافر ہوا تو ٹھیک وگرنہ کہنے والا کافر ہوگا۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"ایما امری قال لاخیہ یا کافر فقد باء بھا احدھما ان کان کما قال والا رجعت علیہ۔" (31)

"جو بھی اپنے بھائی کو کافر کہہ کر مخاطب کرے گا تو ان دو میں سے ایک یقیناً کافر ہے۔ اگر وہ کافر ہے تو ٹھیک وگرنہ کہنے والا کافر ہے۔"

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ملعون ملعون من رمی مؤمنا بکفر ومن رمی مؤمنا بکفر فھو کقتلہ۔" (32)

یعنی "ملعون ہے ملعون ہے وہ شخص جو کسی مومن کو کافر کہتا ہے اور جو مومن کو کافر کہتا ہے وہ اسے قتل کرنے کے مترادف ہے۔"

انہی سخت تاکیدات اور توعیدات کی وجہ سے روز اول سے مسلمان آئمہ اور فقہا نے کسی مسلمان کو کافر کہنے سے نہ صرف اجتناب کیا ہے بلکہ ایسے افراد سے بیزاری کا اظہار کیا ہے جو مسلمانوں کو کافر کہتے تھے۔ ذیل میں ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

فقہاء و علماء شیعہ

۱۔ شیخ صدوقؒ کہتے ہیں:

"الاسلام ھو الاقرار بالشھادتین و ھو الذی یحقن بہ الدماء والاموال ومن قال لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ فقد حقن مالہ و دمہ۔۔۔" (33)

''اسلام شھادتین کے اقرار کا نام ہے۔ اسی سے جان اور اموال محفوظ ہوتے ہیں۔ جو لا الہ الااللہ محمد رسول اللہ کہہ دے تو اس کا مال اور جان محفوظ ہے۔''

یعنی جو اس کے مال یا جان کو نقصان پہنچائے گا وہ گنہگار ہے اور خداوند کریم اس بارے میں اس سے پوچھے گا۔ قیامت کے دن اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔

۲۔ محقق حلی کہتے ہیں:

''یکفی فی الاسلام الاقرار بالشھادتین۔'' (34)

''شھادتین کا اقرار کر لینا مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے۔''

اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں حرقہ قبیلے والوں کی طرف بھیجا۔ ہم نے صبح سویرے ان پر حملہ کیا اور انھیں شکست دی۔ میں اور ایک انصاری شخص ایک آدمی سے بھڑ گئے جب ہم نے اسے گھیر لیا تو وہ لا الہ الا اللہ کہنے لگا۔ یہ سنتے ہی انصاری نے تو ہاتھ روک لیا لیکن میں نے نیزہ مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ جنگ سے واپسی پر جب رسول خدا ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے اسامہ تو نے لاالہ الااللہ کہنے کے بعد اسے قتل کر دیا۔ میں نے عرض کیا اس نے خوف کی وجہ سے کلمہ پڑھا تھا لیکن آپ ﷺ وہی فرماتے رہے کہ تو نے اسے قتل کیوں کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اتنا تکرار کیا کہ میں آرزو کرنے لگا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا تاکہ یہ گناہ معاف ہو جاتا۔

فقہا و علماء اہل سنت

۱۔ ابو الحسن الاشعری کے مایہ ناز شاگرد زاہر بن احمد سرخی کہتے ہیں کہ جب ابو الحسن اشعری کا وقت وفات قریب آیا تو وہ بغداد میں میرے گھر پر تھے۔ مجھے بلا کر کہتے ہیں:

''اشھد علی انی لا اکفر احدًا من اھل ھذہ القبلۃ لان الکل یشیرون الی معبود واحد و انما ھذا اختلاف العبارات۔'' (35)

''گواہ رہنا میں اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی کافر نہیں کہتا کیونکہ یہ تمام لوگ ایک ہی معبود کی طرف گامزن ہیں فقط الفاظ میں اختلاف ہے۔''

۲۔ امام اعظم کا نظریہ

ملا علی قاری کہتے ہیں:

''امام ابو حنیفہ معتقد ہیں کہ جب تک کوئی مسلمان خدا کے حرام کردہ کو حلال نہیں کہتا چاہے جتنا بھی گناہگار ہو اسے کافر نہیں کہہ سکتے بلکہ اس پر در حقیقت مومن کا عنوان صادق آئے گا۔'' (36)

مزید لکھتے ہیں:

''امام ابو حنیفہ اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی کافر نہیں کہتے تھے اور یہی اکثر فقہا کا نظریہ ہے۔''

اس لیے جن افراد نے بعض اہل قبلہ کی تکفیر کا فتوی دیا ہے انھوں نے مشہور اور بڑے فقہا اور متکلمین کے نظریہ کی مخالفت کی ہے۔ بقول ان کے ایسا فتویٰ دینے والے نامعلوم فقہا ہیں اور ان کے فتویٰ کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا فتویٰ حجت نہیں ہے جبکہ تکفیر کا فتویٰ قطعی دلائل کے منافی ہے۔ مزید برآں مسلمان کو کافر کہنے سے کئی ظاہری اور معنوی مفاسد جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا بعض افراد کا یہ فتویٰ (تکفیر) قابل اعتبار نہیں ہے۔ (37)

۳۔ ابو جعفر طحاوی معیار تکفیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم اس وقت تک ہر اہل قبلہ کو مسلمان اور مومن سمجھتے ہیں جب تک وہ ان چیزوں کی تصدیق کرتا ہے جو رسول خداﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے آئے ہیں۔

اہل قبلہ سے مراد وہ افراد ہیں جو مسلمان ہونے کا ادعا کرتے ہیں۔ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ اگرچہ گناہگار ہی کیوں نہ ہو۔ یہ افراد اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں جب تک رسول خداﷺ کے احکام کی تکذیب نہیں کرتے۔ (38)

۴۔ ابن ھمام حنفی (م۸۶۱ھ) شرح الھدایۃ میں لکھتے ہیں:

مسلمان اور اہل قبلہ کو کافر کہنا جائز نہیں ہے جس طرح کہ حضرت ابو حنیفہ اور امام شافعی نے بھی کہا ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی کافر نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ کسی کو کافر کہنا ہی حقیقت میں کلمہ کفر ہے۔ (39)

۵۔ ابوالحسن اشعری مقالات اسلامیین میں کہتے ہیں:

رسول خداﷺ کے بعد مسلمان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو گمراہ کہنے لگے اور ایک دوسرے سے بیزاری کرنے لگے۔ اس طرح مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن اسی کے باوجود وہ سب پرچم اسلام کے تحت آتے ہیں۔(40)

۶۔ تفتازانی اپنی کتاب شرح المقاصد میں لکھتے ہیں:

اہل قبلہ میں سے جب تک کوئی ضروریات دین مثلاً حدوث عالم اور محشر وغیرہ کا انکار نہ کرے وہ کافر نہیں ہے۔(41)

ابن تیمیہ اور مسئلہ تکفیر

ابن تیمیہ معتقد ہے کہ تکفیر یعنی کسی کو کافر قرار دینا کلی طور پر ایک شرعی مسئلہ ہے۔ لہٰذا کتاب اور سنت کی بنیاد پر اسے حل کرنا ہوگا۔ کافر وہ ہے جسے خدا اور رسولﷺ نے کافر کہا ہے۔ یا وہ ان احکام کی تکذیب کرے جسے رسولﷺ نے خدا کی طرف سے بیان کیا ہے۔ بنابریں وہ افراد جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہیں اور ہمارے مخالف ہیں انھیں کافر کہنے سے اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ وہ ہمیں کافر کہتے ہوں اور ہمارے خون کو مباح سمجھتے ہوں۔

اس کے بعد ابن تیمیہ ان احادیث نبوی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مسلمان کے خون، مال اور آبرو کے محفوظ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً

"من صلی صلاتنا و استقبل قبلتنا و اکل ذبیحتنا فذلك المسلم الذی له ذمة الله و ذمة رسوله۔"(42)

"جو ہماری طرح نماز پڑھتا ہے، ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دیتا ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے وہ مسلمان ہے اور اللہ اور اس کے رسولﷺ کے ذمہ ہے۔"

یا وہ روایات جو اظہار شہادتین اور اسلام کے ظواہر احکام کے اقرار کو اسلام کا معیار و ملاک قرار دیتی ہیں۔ یہ تمام روایات صحیح ہیں۔ علماء سلف نے انہی روایات پر عمل کیا ہے اور اپنے درمیان سنگین اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو کافر کہنے سے اجتناب کیا ہے۔ خوارج جن کے قتل کا رسول خدا نے حکم دیا تھا، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان سے جنگ کی۔ صحابہ اور تابعین میں سے آئمہ دین اور ان کے بعد آنے والے فقہا ان کے قتل کو برحق سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود نہ حضرت علی علیہ السلام نے اور نہ

دوسرے صحابہ نے انھیں کافر کہا۔ خوارج سے جنگ در حقیقت ظلم و بغاوت کو کچلنے کے لیے تھی نہ کہ ان کے کافر ہونے کی وجہ سے۔ اسی لیے صحابہ نے ان سے جنگ کے بعد وہ احکام جاری نہیں کیے جو کفار کے ساتھ جنگ کی صورت میں جاری کیے جاتے ہیں۔(43)

حوالہ جات

1۔ عمران: ۱۰۳

2۔انفال: ۶۳

3۔انعام: ۶۵

4۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور پاکستان، ج۱، ص ۵۶۶

5۔ur.wikipedia.org

6۔ حجرات: ۱۰

7۔ مسلم نیشاپوری (م۲۶۱ھ)، صحیح مسلم، بیروت، لبنان، دار الفکر، ج۸، ص۱۱

8۔ کلینی (م۳۲۹ھ) الکافی، طہران، ایران، دار الکتب الاسلامیہ، طبع چہارم، ج ۲، ص ۱۶۶

9۔نسائی (م ۳۰۳ھ) سنن الکبریٰ، بیروت، لبنان، دار الکتب العلمیہ، ج ۲، ص ۲۹۲، ح ۳۴۸۳

10۔امام احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ) مسند احمد، بیروت، لبنان، دار صادر، ج۵، ص ۳۷۰

11۔نسائی: ۹۴

12۔جصاص (م۳۷۰ھ) احکام القرآن، بیروت، لبنان، دار احیاء التراث العربی، طبع ۱۴۰۵ھ، ج۳، ص ۲۲۳

13۔ شوکانی (۱۲۵۵ھ) فتح القدیر، بیروت، دار ابن کثیر، ج۱، ص۵۷۹

14۔بقرہ: ۲۸۵

15۔بقرہ: ۱۷۷

16۔بقرہ: ۲۳۲

17۔ حجرات: ۱۵

18۔امام احمد (م۲۴۱ھ) مسند احمد، بیروت، لبنان، دار صادر، ج۱، ص ۲۷

19۔ شیخ طوسی (م۳۶۰ھ) الامالی، قم، ایران، دارالثقافۃ، ص ۳۸۱ = نیز: مسلم نیشاپوری (م۲۶۱ھ) صحیح مسلم، بیروت، لبنان، دارالفکر، ج ۷، ص ۱۲۱

20۔ بخاری (م۲۵۶ھ) صحیح بخاری، دارالفکر، طبع ۱۹۸۱ئ، ج ۱، ص ۱۱

21۔ بخاری (م۲۵۶ھ) صحیح بخاری، دارالفکر، طبع ۱۹۸۱ئ، ج ۱، ص ۷

22۔ احمد ابن حنبل (م۲۴۱ھ) مسند احمد، بیروت، لبنان، دار صادر، ج ۳، ص ۴۹۱

23۔ نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۲۵

24۔ کلینی (م۳۲۹ھ) الکافی، تہران، ایران، دارالکتب الاسلامیہ، ج ۲، ص ۳۵۸

25۔ متقی ہندی (م۹۷۵ھ) کنزالعمال، بیروت، لبنان، موسسہ الرسالہ، طبع ۱۹۸۹، ج ۳، ص ۵۶۴، ح ۷۹۲۴

26۔ شیخ صدوق (م۳۸۱ھ) الامالی، قم، ایران، موسسہ البعثۃ، ص ۳۱۷

27۔ حجرات: ۱۱

28۔ امام احمد (م۲۴۱ھ) مسند احمد، بیروت، لبنان، دار صادر، ج ۱، ص ۴۳۹

29۔ عبداللہ بن بھرام دارمی (م۲۵۵ھ) سنن الدارمی، دمشق، مطبعۃ الاعتدال

30۔ ابن اشعث سجستانی (م۲۷۵ھ) سنن ابی دائود، دارالفکر، ج ۲، ص ۴۰۹

31۔ مسلم نیشاپوری (م۲۶۱ھ) صحیح مسلم، بیروت، لبنان، دارالفکر، ج ۱، ص ۵۷

32۔ ابوالفتح الکراجی (م۴۴۹ھ) کنزالفوائد، قم، ایران، مکتبۃ المصطفوی، طبع دوئم، ص ۶۳

33۔ شیخ صدوق (م۳۸۱ھ) الھدایۃ، قم، ایران، موسسہ الامام الھادی، ص ۵۴

34۔ محقق حلی (م۶۷۶ھ) شرائع الاسلام، طہران، ایران، ج ۳، ص ۶۳۲

35۔ بیہقی (م۴۵۸ھ) السنن الکبری، دارالفکر، ج ۱۰، ص ۲۰۷

36 ۔ملا علی قاری (۱۰۱۴) شرح کتاب الفقہ الاکبر، تحقیق علی محمد، بیروت، لبنان، دارالکتب العلمیہ، طبع ۱۹۹۵، ص ۳۲۵

37 ۔ملا علی قاری (۱۰۱۴) شرح کتاب الفقہ الاکبر، تحقیق علی محمد، بیروت، لبنان، دارالکتب العلمیہ، طبع ۱۹۹۵، ص ۱۸۹

38۔ ابن ابی العز دمشقی، شرح العقیدۃ الطحاویہ، تحقیق ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی، بیروت، لبنان، موسسہ الرسالہ، طبع اول، ۱۹۸۸، ج ۲، ص ۴۲۶

39۔ مقالہ مولوی کاشانی، ص ۹۰

40۔اشعری (م ۳۲۴ھ) مقالات اسلامیین، تحقیق محمد محی الدین، بیروت، لبنان، مکتبہ العصریہ، طبع ۱۴۱۹ھ، ج۱، ص ۳۴

41۔ تفتازانی (م ۷۹۱ھ) شرح المقاصد فی الکلام، پاکستان، دار المعارف، طبع اول، ۱۹۸۱

42۔ بخاری (م ۲۵۶ھ) صحیح البخاری، بیروت، لبنان، دار الفکر، طبع ۱۹۸۱ئ، ج۱، ص ۱۰۲

43۔ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) مجموع الفتاویٰ، تحقیق عبدالرحمٰن، مکتبہ ابن تیمیہ، منہاج السنۃ النبویہ، موسسہ قرطبہ، طبع ۱۴۰۶ھ، ص ۹۵

احکام اسلامی کا فلسفہ
نہج البلاغہ کی روشنی میں ایک مطالعہ

روشن علی*

roshanali007@yahoo.com

کلیدی الفاظ: انبیاء کرام، احکام اسلامی ، ایمان، فروعات دین ، صلہ رحمی، حدود شرعیہ،

خلاصہ

اللہ نے آنحضرت ﷺ کو ایسی کتاب و شریعت عطا کی جو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہدایت ہے۔آپؐ نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے انسانیت کی رشد و ہدایت کے لیے دو گرانقدر چیزیں چھوڑیں۔ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب دوسرے آپؐ کے اہل بیت اطہار ہیں۔آپ ﷺ کے اہل بیتؑ میں سے حضرت علی علیہ السلام کے کلام کا ایک مجموعہ نہج البلاغہ کی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے جس میں زندگی گزارنے کے تمام اصول موجود ہیں۔ نہج البلاغہ میں احکام اسلامی کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔ ے۔ حضرت نے نہج البلاغہ میں ایمان کے بعد فروعات دین کا فلسفہ بیان فرمایا ہے۔اس کے بعد صلہ رحمی جیسے اہم معاشرتی حکم کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد حدود اور قصاص اور بعض منکرات سے ممانعت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔اس مقالہ میں ۲۰ احکام اسلامی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک حکم کی قرآن و حدیث کی روشنی میں مختصر انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ ایمان سے لے کر اطاعت تک، نماز سے لے کر نہی عن المنکر تک، ایک ایک فقرہ علوم و معارف کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر محسوس ہوتا ہے۔ان میں عقائد سے لے کر عمل صالح تک، سیاست سے لے کر معاشرہ تک ہر ایک کو اعلیٰ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

*۔اسسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، ایف 10/3 اسلام آباد

مقدمہ

نہج البلاغہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس میں اپنی روح پھونک دی۔ پھر اسے مسجود ملائکہ قرار دیا۔ اس کے بعد اسے اپنا نائب بنایا۔ اسے وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ نے انسان کو علم و شریعت عطا کیا تاکہ وہ گمراہی سے محفوظ رہے اور اللہ وحدہ لا شریک کی اطاعت و بندگی سے دور نہ ہو جائے۔ جیسے جیسے انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ان میں اختلافات اور خرافات کا بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اللہ نے ان کے اختلاف کو مٹانے اور ان کو یکجا جمع کرنے کے لیے اپنی طرف سے ضرورت کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنے احکام دے کر بھیجتا رہا۔ انبیاء علیہم السلام کی آمد کا یہ سلسلہ چلتا ہوا آپ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبیؐ بنایا۔ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی کتاب و شریعت عطا کی، جو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہدایت ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو گمراہی سے نکالا، نور کی طرف لے آئے اور انہیں راہ راست پر لگا دیا۔ اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے انسانیت کی رشد و ہدایت کے لیے دو گرانقدر چیزوں کو چھوڑا، ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب دوسرے آپ ﷺ کے اہل بیت اطہارؑ۔ ان میں سے ایک امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں، جنہوں نے ہر ممکن لوگوں کی ہدایت کی اور دنہیں دین اسلام سے روشناس کیا۔ آپ علیہ السلام کے کلام کا ایک مجموعہ نہج البلاغہ کی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، جو کہ ایک انسان ساز نسخہ ہے۔ اس میں زندگی گزارنے کے تمام اصول موجود ہیں۔ ان میں سے آپ علیہ السلام نے چند اسلامی احکام کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ آپ علیہ السلام نے احکام اسلامی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے مختصر عبارت میں مفاہیم کے دریا سمو دیئے ہیں۔ ایک ایک جملہ میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ گویا کوزے میں سمندر کو بند کر دیا ہے۔ یہاں پر ہم اس مقالہ میں ان احکام اسلامی کا تذکرہ کریں گے۔

(۱) ایمان

نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین حضرت علی ابن طالب علیہ السلام چند اسلامی احکام کا فلسفہ بیان کیا ہے جن میں سے پہلا ایمان کا فلسفہ بیان کیا ہے:

"فَرَضَ اللهُ الْإِيمَانَ تَطْهِيراً مِنَ الشِّرْكِ۔" (1)

"اللہ تعالیٰ نے ایمان کا فریضہ عائد کیا شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے۔"

ایمان ہستی خالق کے اقرار اور اس کی یگانگت کے اعتراف کا نام ہے، اور جب انسان کے قلب و ضمیر میں یہ عقیدہ رچ بس جاتا ہے تو کسی دوسرے کے آگے جھکنا گوارا نہیں کرتا، اور نہ ہی کسی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے نہ متاثر بلکہ ذہنی طور پر تمام بندھنوں سے آزاد ہو کر خود کو خدائے واحد کا حلقہ بگوش تصور کرتا ہے۔ اور اس طرح توحید سے وابستگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دامن شرک کی آلودگیوں سے آلودہ نہیں ہونے پاتا۔

اسی طرح ایک اور مقام پر امام علی علیہ السلام ایمان کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ تک رسائی کے لیے وسیلہ کہتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ أَفْضَلَ مَا تَوَسَّلَ بِهِ الْمُتَوَسِّلُونَ إِلَى اللهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى الْإِيمَانُ بِهِ وَ بِرَسُولِهِ۔" (2)

یعنی "اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈنے والوں کے لیے بہترین وسیلہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا ہے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو اس لیے فرض کیا کہ اس کے ذریعے انسان اللہ کے قریب ہو جائے اور جب انسان اللہ کے قریب ہوگا تو وہ شیطانی نجاستوں جیسے شرک وغیرہ سے پاک ہو جائے گا۔ کتنا عظیم ہے یہ جملہ کہ **"اللہ نے ایمان کو تمہیں شرک سے پاک کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔"** یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ توحید کی حقیقیت اور اللہ کی معرفت ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ یعنی انسان فطری طور پر موحد ہے لیکن حالات اسے بدل دیتے ہیں۔ ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ " کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔" (صحیح البخاری ۔ کتاب الجنائز، باب ما قیل فی أولاد المشرکین ۔ حدیث: 1330) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے والدین اسے بنا دیتے ہیں یہودی، عیسائی یا مجوسی۔ اور شرک کی کثافت ایک عارضی نجاست ہے۔ اسلام آیا ہی اسی لیے ہے کہ دلوں کو پاکیزہ بنائے اور زمین کو کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک کرے۔

(۲) نماز

نماز کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"الصَّلَاةَ تَنْزِيهاً عَنِ الْكِبْرِ۔" (3)

''نماز کو فرض کیا تکبر سے بچانے کے لیے۔''

نماز عبادات میں سب سے بڑی عبادت ہے، جو قیام و قعود اور رکوع و سجود پر مشتمل ہوتی ہے اور یہ اعمال غرور و نخوت کے احساسات کو ختم کرنے اور کبر و انانیت کو مٹانے اور عجز و فروتنی کے پیدا کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے۔ کیونکہ مکبّرانہ افعال و حرکات سے نفس میں تکبر و رعونیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور منکسرانہ اعمال سے نفس میں تذلل و خشوع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ان اعمال کی بجاآوری سے انسان متواضع اور منکسر المزاج ہو جاتا ہے۔

چنانچہ وہ عرب کہ جنکے کبر و غرور کا یہ عالم تھا کہ افران کے ہاتھ سے کوڑا گر پڑتا تھا تو اسے اٹھانے کے لیے جھکنا گوارا نہ کرتے تھے اور چلتے ہوئے جوتی کا تسمہ ٹوٹ جاتا تھا تو جھک کر اسے درست کرنا عار سمجھتے تھے سجدوں میں اپنے چہرے خاک مذلت پر بچھانے لگے اور نماز جماعت میں دوسروں کے قدموں کی جگہ اپنی پیشانیاں رکھنے لگے اور غرور و عصبیت جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام کی صحیح روح سے آشنا ہو گئے۔(4)

اسی طرح ایک اور مقام پر حضرت علی علیہ السلام نے نماز کو مکمل دین کہتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''وَإِقَامُ الصَّلَاةِ فَإِنَّهَا الْمِلَّةُ۔'' (5)

''نماز کی پابندی کہ وہ عین دین ہے۔''

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔'' (6)

ترجمہ: ''نماز کے پابند رہو کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور خدا کا ذکر بہت بڑا ہے۔''

یہی نماز تمام بری باتوں سے روکتی ہے جن میں سے ایک بری بات تکبر بھی ہے۔

(۳) زکوۃ

زکوۃ کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''وَ الزَّكَاةَ تَسْبِيباً لِلرِّزْقِ۔'' (7)

''زکوۃ کو فرض کیا رزق میں اضافے کا سبب بنانے کے لیے۔''

ہر با استطاعت مسلمان اپنے مال میں سے ایک مقررہ مقدار سال بہ سال ان لوگوں کو دے ککہ جو وسائل حیات سے بالکل محروم یا سال بھر کے آزوقہ کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے ہوں۔ یہ اسلام کا ایک اہم فریضۃ ہے جس سے غرض و یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی کوئی فرد محتاج و مفلس نہ رہے اور احتیاج و افلاس سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان سے محفوظ رہیں اور اس کے علاوہ یہ بھی مقصد ہے کہ دولت چلتی پھرتی اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہے اور چند مخصوص افراد کے لیے مخصوص ہو کر نہ رہے جائے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۔" (8)

ترجمہ: "اور تم جو چیز خرچ کروگے وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

"مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً۔" (9)

ترجمہ: "کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے میں اس کو کئی حصے زیادہ دے گا؟"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

"مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔" (10)

ترجمہ: "جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے، وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اسی طرح ای حدیث رسول ﷺ کی میں اس طرح ارشاد ہے:

"حدثنا إسماعيل، قال: حدثني أخي، عن سليمان، عن معاوية بن أبي مزرد، عن أبي الحباب، عن أبي هريرة رضي الله عنه، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " ما من يوم يصبح العباد فيه

،إلا ملكان ينزلان ، فيقول أحدهما : اللهم أعط منفقا خلفا ، ويقول الآخر : اللهم أعط ممسكا تلفا۔" (11)

یعنی "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر صبح کو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ایک کہتا ہے : اے میرے اللہ ! خرچ کرنے والے کو اس کا عوض اور بدلہ عطا کر اور نہ دینے والے کے (مال کو) تلف کر دے۔"

(۴) روزہ

روزہ کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"الصِّيَامَ ابْتِلَاءً لِإِخْلَاصِ الْخَلْقِ۔" (12)

"روزہ کو فرض کیا مخلوق کے اخلاص کو آزمانے کے لیے۔"

روزہ وہ عبادت ہے جس میں ریا کا شائبہ نہیں ہوتا اور نہ حسن نیت کے علاوہ کوئی اور جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ چنانچہ تنہائی میں جبکہ بھوک بے چین کئے ہوئے ہو، پیاس تڑپا رہی ہو نہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے، نہ پانی کی خواہش بے قابو ہونے دیتی ہے، حالانکہ اگر کھا پی لیا جائے تو پیٹ میں جھانک کر دیکھنے والا نہیں ہوتا، مگر ضمیر کا حسن اور خلوص نیت کا جوہر نیت کو ڈانوڈول نہیں ہونے دیتا اور یہی روزہ کا سب سے بڑا فائدہ ہے کہ اس سے عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"وحدثنا أبوبكر بن أبي شيبة ، حدثنا محمد بن فضيل ، عن أبي سنان ، عن أبي صالح ، عن أبي هريرة ، وأبي سعيد رضى الله عنهما ، قالا : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : "إن الله عزوجل يقول : إن الصوم لي وأنا أجزي به۔" (13)

"حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔"

(۵) حج

حج کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَالْحَجَّ تَقْرِبَةً لِلدِّينِ۔" (14)

"حج کو فرض کیا دین کو تقویت پہنچانے کے لیے۔"

حج کا مقصد یہ ہے کہ حلقہ بگوشان اسلام اطراف اکناف عالم سے سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہوں تاکہ اس عالمی اجتماع سے اسلام کی عظمت کا مظاہرہ ہو اور اللہ کی پرستش و عبادت کا ولولہ تازہ اور آپس میں روابط کے قائم کرنے کا موقع حاصل ہو۔

"لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ۔" (15)

ترجمہ: "تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لئے حاضر ہوں اور (قربانی کے) ایام معلوم میں چہار پایاں مویشی (کے ذبح کے وقت) جو خدا نے ان کو دیے ہیں ان پر خدا کا نام لیں اس میں سے تم بھی کھاؤ اور فقیر درماندہ کو بھی کھلاؤ۔"

(۶) جہاد

جہاد کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَالْجِهَادَ عِزّاً لِلْإِسْلَامِ۔" (16)

"جہاد کو فرض کیا اسلام کو سرفرازی بخشنے کے لیے۔"

جہاد کا مقصد یہ ہے کہ جو قوتیں اسلام کی راہ میں مزحم ہوں ان کے خلاف امکانی طاقتوں کے ساتھ جنگ آزما ہوا جائے تاکہ اسلام کو فروغ و استحکام حاصل ہو، اگرچہ اس راہ میں جان کے لیے خطرات پیدا ہوتے ہیں اور قدم قدم پر مشکلیں حائل ہوتی ہیں مگر راحت ابدی و حیات دائمی کی نوید، ان تمام مصیبتوں کو جھیل لے جانے کی ہمت بندھاتی رہتی ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"وَالْجِهَادُ فِي سَبِيلِهِ فَإِنَّهُ ذِرْوَةُ الْإِسْلَامِ۔" (17)

"اللہ کی راہ میں جہاد کہ وہ اسلام کی بلند چوٹی ہے۔"

پس اسی جہاد کے ذریعے اللہ دین اسلام کو سربلندی عطا کرتا ہے اور معاشرہ میں موجود فتنہ و فساد کا خاتمہ کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔''(18)

ترجمہ: ''اور خدا نے ان کو بادشاہی اور دانائی بخشی اور جو کچھ چاہا سکھایا اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے نہ ہٹاتا رہتا تو ملک تباہ ہو جاتا لیکن خدا اہل عالم پر بڑا مہربان ہے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

''وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ط وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔''(19)

ترجمہ: ''اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعہ اور (عیسائیوں کے) گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت ساذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے بیشک خدا توانا اور غالب ہے۔''

اگر کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ایک جماعت کو دوسری سے لڑنے بھڑنے کی اجازت نہ ہو، تو یہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔ اس نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز یا ہر شخص یا ہر جماعت دوسری چیز یا شخص یا ہر جماعت کے مقابلہ میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لیے جنگ کرتی رہے اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر بدی کے مقابلہ میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان زمین پر باقی نہ رہتا۔

بد دین اور شریر لوگ جن کی ہر زمانہ میں کثرت رہی ہے تمام مقدس مقامات اور یادگاریں ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیتے۔ کوئی عبادت گاہ، تکیہ، خانقاہ، مسجد، مدرسہ محفوظ نہ رہ سکتا۔ بناء علیہ ضروری ہوا کہ بدی کی طاقتیں خواہ کتنی ہی مجتمع ہو جائیں قدرت کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے مقدس ہاتھوں سے بدی کے حملوں کی مدافعت کرائی جائے۔ اور حق تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی خود مدد فرما کر ان کو دشمنان حق و صداقت پر غالب کرے بلاشبہ وہ ایسا قوی اور زبردست ہے کہ اس کی اعانت وامداد کے بعد ضعیف سے ضعیف چیز بڑی بڑی طاقتور ہستیوں کو شکست دے سکتی ہے۔

بہر حال اس وقت مسلمانوں کو ظالم کافروں کے مقابلہ میں جہاد و قتال کی اجازت دینا اسی قانونِ قدرت کے ماتحت تھا اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقلمند نہیں کر سکتا۔ اگر مدافعت و حفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانہ میں نہ عیسائی راہبوں کے صومعے (کوٹھڑے) قائم رہتے نہ نصاریٰ کے گرجے، نہ یہود کے عبادت خانے نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ سب عبادت گاہیں گرا کر اور ڈھا کر برابر کر دی جاتیں۔ پس اس عام قانون کے ماتحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک وقت مناسب پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔

(۷) امر بالمعروف

امر بالمعروف کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"اَلْاَمْرَبِالْمَعْرُوفِ مَصْلَحَةً لِلْعَوَامِّ۔" (20)

"امر بالمعروف کو فرض کیا اصلاح خلائق کے لیے۔"

امر بالمعروف دوسروں کو صحیح راہ دکھانے اور غلط روی سے باز رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے

(۸) نہی عن المنکر

نہی عن المنکر کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ رَدْعاً لِلسُّفَهَاءِ۔" (21)

"نہی عن المنکر کو فرض کیا سر پھروں کی روک تھام کے لیے۔"

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اصول تمام الہی ادیان میں موجود ہے اور اسے تمام انبیاء و رسل، ائمہ و مؤمنین کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ صرف شرعی اور فقہی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ انبیاء و رسل کی رسالت و نبوت کا معیار ااور ان کی بعثت کی ایک علت بھی تھا۔ کیونکہ یہ مادی کائنات حق و باطل، خیر و شر، نیکی و بدی، اچھائی و برائی، نور و ظلمت، اور فضائل و رذائل کے دائمی ٹکراؤ کی جگہ ہے۔

اور یہ امور کبھی آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ ان کی پہچان اور ان پر عمل سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ الٰہی ادیان میں لوگوں کو حق و باطل، خیر و شر، خوب و بد، نور ظلمت اور فضیلت و رذیلت کی پہچان کرواتے ہوئے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ہر معروف کو انجام دیں اور ہر منکر سے رک جائیں، یوں وہ اس

ہدایت کے ذریعے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کیے جاتے ہیں۔اسی لیے قرآن کریم نے مسلم امۃ کو بہترین امت کہا ہے کہ:

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔" (22)

ترجمہ: "تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا، ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں لیکن اکثر تو فاسق ہیں۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو تمام امتوں سے بہترین اور افضل قرار دیا ہے۔

(۹) صلہ رحمی

صلہ رحمی کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَ صِلَةَ الرَّحِمِ مَنْمَاةً لِلْعَدَدِ۔" (23)

"صلہ رحم (قربتداروں کے حقوق) کو فرض کیا (یار و انصار کی) گنتی بڑھانے کے لیے۔"

صلہ رحمی یہ کہ انسان اپنے قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور کم از کم باہمی سلام و کلام کا سلسلہ قطع نہ کرے تاکہ دلوں میں صفائی پیدا ہو اور خاندان کی شیرازہ بندی ہو کر یہ بکھرے ہوئے افراد ایک دوسرے کے دست و بازو ثابت ہوں۔

"وَ صِلَةُ الرَّحِمِ فَإِنَّهَا مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ وَ مَنْسَأَةٌ فِي الْأَجَلِ۔" (24)

"صلہ رحمی کرنا مال میں مال کی فراوانی اور عمر کی درازی کا سبب ہے۔"

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے:

" حدثنا أحمد بن محمد قال : أخبرنا عبد الله بن المبارك ، عن عبد الملك بن عيسى الثقفي ، عن يزيد ، مولى المنبعث ، عن أبي هريرة ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال : "تعلموا من أنسابكم ما تصلون به أرحامكم ، فإن صلة الرحم محبة في الأهل ، مثراة في المال ، منسأة في الأثر۔" (25)

''حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے انساب کو جانو جن کے ساتھ تم صلہ رحمی کرتے ہو کیونکہ صلہ رحمی اپنے خاندان میں محبت پیدا کرتا ہے، مال میں فراوانی ہوتی ہے اور عمر زیادہ ہوتی ہے۔''

(۱۰) قصاص

قصاص کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''اَلْقِصَاصَ حَقْناً لِلدِّمَاءِ۔'' (26)

''قصاص کو فرض کیا خون ریزی کے انسداد کے لیے۔''

قصاص ایک حق ہے جو مقتول کے وارثوں کو دیا گیا ہے کہ وہ قتل کے بدلے میں قتل کا مطالبہ کریں تاکہ پاداش جرم کے خوف سے آئندہ کسی کو قتل کرنے کی جرات نہ ہو سکے۔ اور وارثوں کے جوش انتقام میں ایک جان زیادہ جانوں کے ہلاک ہونے کی نوبت نہ پہنچے۔ بے شک عفو و درگزر اپنے مقام پر فضیلت رکھتا ہے مگر جہاں حقوق بشر کی پامالی اور امن عالم کی تباہی کا سبب بن جائے، اسے اصلاح نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اس موقع پر قتل و خون ریزی کے انسداد اور حیات انسانی کی بقا کا واحد ذریعہ قصاص ہی ہوگا۔

''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔'' (27)

ترجمہ: ''اور اے اہل عقل! (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگانی ہے کہ تم (قتل وخونریزی سے) بچو۔''

حکم قصاص بظاہر نظر اگرچہ بھاری معلوم ہو لیکن عقلمند سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حکم بڑی زندگانی کا سبب ہے کیونکہ قصاص کے خوف سے ہر کوئی کسی کو قتل کرنے سے رُکے گا تو دونوں کی جان محفوظ رہے گی اور قصاص کے سبب قاتل اور مقتول دونوں کی جماعتیں بھی قتل سے محفوظ اور مطمئن رہیں گی عرب میں ایسا ہوتا تھا کہ قاتل اور غیر قاتل کا لحاظ نہیں کرتے تھے جو ہاتھ آجاتا مقتول کے وارث اس کو قتل کر ڈالتے تھے اور فریقین میں اس کے باعث ایک خون کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہونے کی نوبت آتی تھی جب خاص قاتل ہی سے قصاص لیا گیا تو یہ تمام جانیں بچ گئیں اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قصاص قاتل کے حق میں باعث حیاتِ اُخروی ہے۔

(۱۱) حدود قائم کرنا

حدود قائم کرنے کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَإِقَامَةَ الْحُدُودِ إِعْظَاماً لِلْمَحَارِمِ۔" (28)

"حدود شرعیہ کے اجرا کو فرض کیا محرمات کی اہمیت کو قائم کرنے کے لیے۔"

اجرائے حدود کا مقصد یہ ہے کہ محرمات الٰہیہ کے مرتکب ہونے والے کو جرم کی سنگینی کا احساس دلایا جائے تاکہ وہ سزا و عقوبت کے خوف سے منہیات سے اپنا دامن بچا رکھے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"حدثنا يحيى بن بكير، حدثنا الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب، عن عروة، عن عائشة رضى الله عنها، قالت: "ما خير النبى صلى الله عليه وسلم بين أمرين إلا اختار أيسرهما ما لم يأثم، فإذا كان الإثم كان أبعدهما منه، والله ما انتقم لنفسه فى شىء يؤتى إليه قط، حتى تنتهك حرمات الله، فينتقم لله۔" (29)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی دو کاموں میں اختیار دیا گیا تو آپ ﷺ نے ان میں سے آسان کام کو اختیار کیا جب تک کہ کوئی گناہ نہ کرے۔ لیکن جب گناہ ہو جائے تو آپؐ سخت حکم کو اختیار کرتے تھے۔ اللہ کی قسم آپؐ نے کبھی بھی اپنی ذات کے لیے کوئی انتقام نہیں لیا یہاں تک کہ اللہ کی حرمت پامالی کی جاتی (اللہ کی حدود کی نافرمانی کی جاتی) تو آپؐ اللہ کی خاطر ان کا انتقام لیتے تھے۔"

(۱۲) شراب نوشی ترک کرنا

شراب کے حرام ہونے کے فلسفے کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَتَرْكَ شُرْبِ الْخَمْرِ تَحْصِيناً لِلْعَقْلِ۔" (30)

"شراب خوری کو ترک کرنا فرض کیا عقل کی حفاظت کے لیے۔"

شراب نوشی ذہنی انتشار، پراگندگی، حواس اور زوال عقل کا باعث ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان وہ قبیح افعال کر گزرتا ہے، جن کی ہوش و حواس کی حالت میں اس سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ یہ صحت کو تباہ اور طبیعت کو وبائی امراض کی پذیرائی کے لیے مستعد کر دیتی ہے اور بے خوابی، ضعف

اعصاب اور نقرس وغیرہ امراض اس کالازمی خاصہ ہیں اور انہی مفاد و مفاسد کو دیکھتے ہوئے شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ایک حدیث میں ارشاد ہے:

"ثنا يعقوب بن إبراهيم البزاز , ثنا أبو حاتم الرازی , نا أبو صالح كاتب الليث , حدثنی ابن لهيعة , عن أبی قبيل , عن عبد الله بن عمرو , قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "الخمر أم الخبائث" (31)

"عبد اللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شراب ام الخبائث (تمام خباثتوں کی جڑ) ہے۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شراب ایک ایسا گناہ ہے جس کے ذریعے کئی اور گناہ جنم دیتے ہیں۔اسی طرح قرآن کریم میں شراب کے حرام اور نجس ہونے کے بارے میں ارشاد ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔" (32)

ترجمہ: "اے ایمان والو! شراب اور جُوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام شیطان کے عمل میں سے ہیں۔پس ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض ڈلوادے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔کیا تم ان سے باز آجاؤ گے۔"

(۱۳) چوری سے روکنا

چوری کے حرام ہونے کے فلسفے کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَمُجَانَبَةَ السَّرِقَةِ إِيجَاباً لِلْعِفَّةِ۔" (33)

"چوری سے پرہیز کو فرض کیا پاک بازی کا باعث ہونے کے لیے۔"

دوسروں کے مال میں دست درازی کرنا وہ قبیح عادت ہے جو، حرص و ہوائے نفس کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ مشتہیات نفس کو حد افراط سے ہٹا کر نقطہء اعتدال پر لانا عفت ہے کہلاتا ہے اس

لیے بڑھتی ہوئی خواہش اور طمع کو روک کر چوری سے اجتناب کرنا باعث عفت ہوگا۔اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل قبیح کے انجام دینے والے کے ہاتھ کو کاٹنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۔" (34)

ترجمہ: "جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو یہ ان کے فعلوں کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔ اور خدا زبردست اور صاحب حکمت ہے۔"

(۱۴) زنا ترک کرنا

زنا کے حرام ہونے کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"تَرْكَ الزِّنَىٰ تَحْصِيناً لِلنَّسَبِ۔" (35)

"زناکاری سے بچنے کو فرض کیا نسب کو محفوظ رکھنے کے لیے۔"

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے زنی کو بے حیائی سے تعبیر کیا ہے، سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

"وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِیْلًا۔" (36)

ترجمہ: "اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔"

(۱۵) لواط ترک کرنا

ترک لواط کے فلسفہ کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"تَرْكَ اللِّوَاطِ تَكْثِيراً لِلنَّسْلِ۔" (37)

"اغلام کے ترک کو فرض کیا نسل بڑھانے کے لیے۔"

اللہ تعالیٰ نے زنا اور لواط کو اس لیے حرام کیا تاکہ نسب محفوظ رہے اور نسل انسانی پھلے پھولے اور بڑھے کیونکہ کہ زنا سے پیدا ہونے والی اولاد، اولاد ہی قرار نہیں پاتی کہ اس سے نسب ثابت ہو۔ اسی لیے اسے مستحق میراث نہیں قرار دیا جاتا اور خلاف فطرت افعال سے نسل کے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان قبیح افعال کے نتیجے میں انسان ایسے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے جو قطع نسل کے ساتھ زندگی کی بربادی کا سبب ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو جو کہ لواط جیسے

فعل قبیح میں مبتلا تھی اس کو اس فعل قبیح کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں تک اس کو عبرت قرار دیا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۔اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔'' (38)

ترجمہ: ''اور جب ہم نے لوط کو پیغمبر بنا کر بھیجا تو اس وقت انہوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کا کام کیوں کرتے ہو کہ تم سے پہلے اہل عالم میں سے کسی نے اس طرح کا کام نہیں کیا؟ خواہش نفسانی کو پورا کرنے کیلئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں پر گرتے ہو۔ حقیت یہ کہ تم حد سے گزرنے والے ہو۔''

(۱۶) گواہی کا فرض ہونا

گواہی کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''وَ الشَّهَادَاتِ اسْتِظْهَاراً عَلَى الْمُجَاحَدَاتِ۔'' (39)

''گواہی کو فرض کیا انکارِ حقوق کے مقابلہ میں ثبوت مہیا کرنے کے لیے۔''

قانون شہادت کی اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اگر ایک فریق دوسرے فریق کے کسی حق کا انکار کرے تو شہادت کے ذریعے اپنے حق کا اثبات کر کے اسے محفوظ کر سکے۔ گواہی کو قرآن کریم میں کثرت سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے صرف ایک آیت کریمہ کے ایک حصہ کو ذکر کرتے ہیں:

''هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا۔'' (40)

ترجمہ: ''جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے اور اپنے میں سے دو مردوں کو (ایسے معاملے کے) گواہ کر لیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو (کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی اور جب گواہ (گواہی کے لئے) طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔''

اس آیت کریمہ میں واضح بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی لین دین اور قرض وغیرہ کے معاملات کئے جائیں تو ان کو لکھا جائے اور اس پر گواہوں کو مقرر کیا جائے تاکہ کسی فریق کو کوئی نقصان نہ ہو اگر ایک فریق اس معاملے کا انکار کرے تو دوسرے فریق کے حق میں گواہ موجود ہوں جو گواہی دیں اسی طرح کسی کا حق تلف نہ ہو۔

(۱۷) جھوٹ سے پرہیز کرنا

جھوٹ سے پرہیز کے فلسفہ کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَتَرْكَ الْكَذِبِ تَشْرِيفاً لِلصِّدْقِ۔" (41)

"جھوٹ سے علیحدگی کو فرض کیا سچائی کا شرف آشکارا کرنے کے لیے۔"

کذب اور دروغ سے اجتناب کا حکم اس لیے ہے تاکہ اس کی ضد یعنی صداقت کی عظمت واہمیت نمایاں ہو اور سچائی کے مصالح و منافع کو دیکھ کر جھوٹ سے پیدا ہونے والی اخلاقی کمزوریوں سے بچا جائے۔ایک حدیث نبوی میں ارشاد ہے:

"حدثنا محمد بن عبد الله بن نمير، حدثنا أبو معاوية، ووكيع، قالا : حدثنا الأعمش، ح وحدثنا أبو كريب، حدثنا أبو معاوية، حدثنا الأعمش، عن شقيق، عن عبد الله ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "عليكم بالصدق ، فإن الصدق يهدي إلى البر، وإن البر يهدي إلى الجنة، وما يزال الرجل يصدق ويتحرى الصدق حتى يكتب عند الله صديقا، وإياكم والكذب، فإن الكذب يهدي إلى الفجور، وإن الفجور يهدي إلى النار، وما يزال الرجل يكذب ويتحرى الكذب حتى يكتب عند الله كذابا۔" (42)

"حضرت عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر سچ بولنا فرض ہے کیونکہ سچ نیکی کی طرف ہدایت کرتا ہے اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔جو شخص ہمیشہ سچ بولتا رہے گا اور بہت زیادہ سچ بولے گا یہاں تک کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں صدیق لکھا جائے گا۔ جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے اور فسق و فجور انسان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اور جو شخص ہمیشہ جھوٹ بولتا رہے گا اور اتنا کثرت سے جھوٹ بولے گا یہاں تک کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں جھوٹا لکھا جائے گا۔"

(۱۸) قیام امن

قیام امن کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی السلام کا ارشاد ہے:

"وَ السَّلَامَ أَمَاناً مِنَ الْمَخَاوِفِ۔" (43)

"قیامِ امن کو فرض کیا خطروں سے تحفظ کے لیے۔"

سلام کے معنی امن و صلح پسندی کے ہیں اور ظاہر ہے کہ صلح پسندانہ روش خطرات سے تحفظ اور جنگ و جدال کی روک تھام کا کامیاب ذریعہ ہے۔ عموماً شارحین نے سلام کو سلام و دعا کے معنی میں لیا ہے لیکن سیاق کلام اور فرائض کے ذیل میں اس کا تذکرہ اس معنی کی تائید نہیں کرتا۔ بہر حال اس معنی کی رو سے سلام خطرات سے تحفظ کا ذریعہ ہے اس طرح کہ اسے امن سلامتی کا شعار سمجھا جاتا ہے اور جب دو مسلمان آپس میں ایک دوسرے پر سلام کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور دوستی کا اعلان کرتے ہیں، جس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔

(۱۹) امانت

امانت کے فلسفہ کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَ الْأَمَانَةَ نِظَاماً لِلْأُمَّةِ۔" (44)

"امانتوں کی حفاظت کو فرض کیا امت کا نظام درست رکھنے کے لیے۔"

امانت کا تعلق صرف مال ہی سے نہیں بلکہ اپنے متعلقہ امور کی بجاآوری میں کوتاہی کرنا بھی امانت کے منافی ہے، تو جب مسلمان اپنے فرائض و متعلقہ امور کا لحاظ رکھیں گے تو اس سے نظم و نسق ملت کا مقصد حاصل ہوگا اور جماعت کی شیرازہ بندی پایہ تکمیل کو پہنچے گی۔ اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا۔" (45)

ترجمہ: "خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو"

جب امانت کو ان کے اہل لوگوں تک منتقل کیا جائے گا تو کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوگا جس کے نتیجے میں امت کا نظام درست ہوگا اور پورا معاشرہ امن و امان کا گہوارہ بن جائے گا۔

(۲۰) اطاعت

اطاعت کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"وَ الطَّاعَةَ تَعْظِيماً لِلْإِمَامَةِ۔" (46)

"اطاعت کو فرض کیا امامت کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے۔"

امامت کا مقصد یہ ہے کہ امت کی شیرازہ بندی ہو اور اسلام کے احکام تبدیل و تحریف سے محفوظ رہیں۔ کیونکہ اگر امت کا کوئی سربراہ اور دین کا کوئی محافظ نہ ہو تو نہ امت کا نظم و نسق باقی رہ سکتا ہے اور نہ احکام دوسرے کی دسبرد سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب امت ہر اس کی اطاعت بھی واجب ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ مطاع اور واجب الاطاعت نہ ہو گا تو وہ نہ عدل و انصاف قائم کر سکتا ہے اور نہ ظالم سے مظلوم کا حق دلا سکتا ہے نہ قوانین شریعت کا اجراء و نفاذ کر سکتا ہے اور نہ دنیا سے فتنہ و فساد کے ختم ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر نہج البلاغہ میں امام کی ذمہ داریوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

"إِنَّهُ لَيْسَ عَلَى الْإِمَامِ إِلَّا مَا حُمِّلَ مِنْ أَمْرِ رَبِّهِ الْإِبْلَاغُ فِي الْمَوْعِظَةِ وَ الِاجْتِهَادُ فِي النَّصِيحَةِ وَ الْإِحْيَاءُ لِلسُّنَّةِ وَإِقَامَةُ الْحُدُودِ عَلَى مُسْتَحِقِّيهَا وَإِصْدَارُ السُّهْمَانِ عَلَى أَهْلِهَا۔" (47)

"امام کا فرض تو بس یہ ہے کہ جو کام اسے اپنے پروردگار کی طرف سے سپرد ہوا ہے اسے انجام دے اور وہ یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کی باتیں ان تک پہنچائے۔ اور انہیں نصیحت کرنے میں پوری پوری کوشش کرے۔ سنت کو زندہ رکھے۔ جن پر حد لاگو ہوتی ہے ان پر حد جاری کرے اور حصوں کو ان کے اصلی وارثوں تک پہنچائے۔"

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔" (48)

ترجمہ: "مومنو! خدا اور اس کے رسول کی کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب امر ہے ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے

ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو اور یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔"

نتیجہ

اس مقالہ میں 20 احکام اسلامی کا فلسفہ بیان کیا گیا، جن میں سے ہر ایک حکم کو قرآن و حدیث کی روشنی میں مختصر انداز میں واضح کیا گیا۔ ایمان سے لے کر اطاعت تک، نماز سے لے کر نہی عن المنکر تک، ایک ایک فقرہ علوم و معارف کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر محسوس ہوتا ہے۔ ان میں عقائد سے لے کر عمل صالح تک، سیاست سے لے کر معاشرہ تک ہر ایک کو اعلیٰ انداز میں پیش کیا گیا۔

حوالہ جات

1۔ نہج البلاغہ، مترجم مفتی جعفر حسین، ناشر معراج کمپنی لاہور، سال طبع دسمبر 2013، قول: 252

2۔ ایضا خطبہ 108

3۔ نہج البلاغہ، قول: 252

4۔ ایضا، صفحۃ 685

5۔ ایضا خطبہ: 108

6۔ القرآن کریم، سورۃ العنکبوت، آیت 45

7۔ نہج البلاغہ، قول: 252

8۔ القرآن الکریم، سورۃ سبا، آیت: 39

9۔ القرآن الکریم، سورۃ البقرہ، آیت: 245

10۔ ایضا، آیت: 261

11۔ صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول اللہ تعالی: فأما من اِعطی واتقی - حدیث: 1385

12۔ نہج البلاغہ، قول: 252

13۔ صحیح مسلم - کتاب الصیام باب فضل الصیام - حدیث: 2016 / صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالی: یریدون اِن یبدلوا کلام اللہ - حدیث: 7076

14۔ نہج البلاغہ، قول:252
15۔ القرآن الکریم سورۃ الحج، آیت:28
16۔ نہج البلاغہ، قول:252
17۔ ایضا، خطبہ 108
18۔ القرآن الکریم، سورۃ البقرہ، آیت 251
19۔ القرآن الکریم، سورۃ الحج، آیت 40
20۔ نہج البلاغہ، قول:252
21۔ ایضا، قول:252
22۔ القرآن الکریم، سورۃ آل عمران، آیت 110
23۔ نہج البلاغہ، قول:252
24۔ ایضا، خطبہ 108
25۔ سنن الترمذی الجامع الصحیح، إبواب البر والصلۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ماجاء فی تعلیم النسب، حدیث:1950
26۔ نہج البلاغہ، قول:252
27۔ القرآن الکریم، سورۃ البقرہ، آیت 179
28۔ نہج البلاغہ، قول:252
29۔ صحیح البخاری۔کتاب الحدود، باب إقامۃ الحدود والانتقام لحرمات اللہ۔ حدیث:6416
30۔ نہج البلاغہ، قول:252
31۔ سنن الدار قطنی۔کتاب الاشربۃ وغیرہا، حدیث:4045
32۔ القرآن الکریم، سورۃ المائدہ:آیت 90-91
33۔ نہج البلاغہ، قول:252
34۔ القرآن الکریم، سورۃ المائدہ:آیت:38
35۔ نہج البلاغہ، قول:252
36۔ القرآن الکریم، سورۃ بنی اسرائیل:آیت 32
37۔ نہج البلاغہ، قول:252
38۔ القرآن الکریم، سورۃ الاعراف، آیت 80-81

39۔ نہج البلاغہ، قول: 252
40۔ القرآن الکریم، سورۃ البقرہ، آیت: 282
41۔ نہج البلاغہ، قول: 252
42۔ صحیح مسلم - کتاب البر والصلۃ والآداب، باب قبح الکذب وحسن الصدق وفضلہ - حدیث: 4828
43۔ نہج البلاغہ، قول: 252
44۔ ایضا، قول: 252
45۔ القرآن الکریم، سورہ النساء، آیت 58
46۔ نہج البلاغہ، قول: 252
47۔ ایضا خطبہ 103، صفحہ 239
48۔ القرآن الکریم، سورۃ النِّسَاء: 59

امام خمینی علیہ الرحمہ

انسان اس وقت حکیم الٰہی یا عالم ربانی وروحانی ہونے کا مرتبہ حاصل کرتا ہے جب اس کا علم الٰہی اور ربانی ہو۔ پس اگر وہ علم توحید و تجرید کی بحث تو کرے، لیکن اس بحث کی بنیاد طلب حق اور خدا خواہی کے جذبے پر استوار نہ ہو، بلکہ خود علم و فن یا نفس اور اس کی خواہشات نے اسے علم و فن کے حصول پر راغب کیا ہو تو نہ اس کا علم خدا کی نشانی بن سکتا ہے اور نہ اس کی حکمت، حکمت الٰہیہ ہو سکتی ہے، بلکہ یہ نفسانی اور مادی ہوں گے۔ بنابریں میری نظر میں علما کے یہاں معروف یہ مقولہ درست نہیں کہ علم کی ایک قسم وہ ہے جو بذات خود مطلوب ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر علم کسی مقصد کے حصول کیلئے اور کسی خاص چیز کی تمہید ہوتا ہے۔ پس علم توحید اور علمی توحید دونوں توحید قلبی کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

یاد رہے کہ قلبی توحید ہی عملی توحید ہے جو مسلسل کوشش، غور و فکر اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ توحید علمی کے حصول کیلئے زندگیاں صرف کرتے ہیں اور اپنے تمام اوقات کو مطالعہ و مباحثہ اور تعلیم و تعلّم میں گزار دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ توحید کے رنگ میں رنگے نہیں جاتے۔ یہ لوگ نہ عالم ربانی بنتے ہیں نہ حکیم ربانی۔ ان کا قلبی تزلزل دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔

(اقتباس از کتاب شرح حدیث جنود عقل و جہل ص ۱۶)

آئمہ اطہار علیہم السلام کی مختلف زبانوں سے آشنائی

سید حسنین عباس گردیزی
hasnain.gardezi@gmail.com

کلیدی الفاظ: علم لَدنی، پیغمبر اکرمؐ کی وراثت، الہامات الہیہ، سامی اقوام، سریانی زبان۔

خلاصہ

مکتب اہل بیت میں علم امام کی بحث عقیدہ امامت کے فروعات میں سے ہے، جس کے مطابق امام کا وسیع علم امام معصوم کی خصوصیات میں سے ہے اور وہ علم لَدنی کا مالک ہوتا ہے۔ اس کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ امام دین کا محافظ اور مفسر ہوتا ہے۔ اگر وہ دین کے تمام علوم سے آگاہ نہ ہو تو اس کی حفاظت اور تبیین و تفسیر کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ متکلمین امامیہ کے نزدیک علم امام کے سرچشموں میں سے ایک قرآن مجید ہے۔ دوسرا، علوم نبوت ہیں۔ امام نبی کا جانشین ہونے کے ناطے نبی کے علوم کا بھی وارث ہوتا ہے۔ علم امام کا تیسرا منبع الہامات الہیہ ہیں جو فرشتوں کے ذریعے یا روح القدس کے ذریعے امام کو منتقل ہوتے ہیں البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسے الہامات اور وحی الٰہی میں فرق ہے، وحی فقط انبیائے کرام سے مختص ہے، غیر نبی کو وحی نہیں ہوتی۔ امام نبی نہیں ہوتا بلکہ نبی کا وصی اور جانشین ہوتا ہے۔

اہل بیتؑ کی روایات میں ائمہ اطہارؑ کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ محدَّث تھے۔ یعنی فرشتوں کی گفتگو سنتے تھے اور اُن سے الٰہی تعلیمات اخذ کرتے تھے۔ امام کے وسیع علم کا لازمہ یہ ہے کہ امام دنیا کے تمام لوگوں کے ساتھ ہم کلام بھی ہوسکے اور ان کی زبان میں اُن کی ہدایت کا فریضہ بھی انجام دے سکے۔ اس مقالے میں اسی موضوع کے بارے میں وضاحت پیش کی گئی ہے۔ معصومین علیہم السلام سے مروی متعدد روایات بتاتی ہیں کہ آئمہ معصومین علیہم السلام بعض زبانوں کا علم رکھتے تھے۔ روایات کے مطابق ائمہ اطہارؑ نے جن زبانوں میں گفتگو فرمائی ہیں اُن میں نبطی، سریانی، ہندی، سندھی، زطّی، یونانی، عبرانی، افریقی یعنی حبشی، ترکی اور صقلبی زبانیں شامل ہے۔

مقدمہ

مکتب اہل بیت میں عقیدہ امامت کے فروعات میں سے ایک اہم کلامی بحث علم امام ہے جس کے مطابق امام معصوم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت اُس کا وسیع علم ہے اور وہ علم لَدنی کا مالک ہوتا ہے۔امام کے علوم عام انسانی علوم کی طرح نہیں ہوتے اور امام کسی عام انسان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرکے علم حاصل نہیں کرتا بلکہ امام کا علم خدادادی ہوتا ہے جسے اصطلاحاً علم لَدنی کہاجاتا ہےامام کے وسیع اور غیر معمولی علم کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ امام دین کا محافظ اور مفسر و مبیّن ہوتا ہے۔اگر وہ دین کے تمام علوم سے آگاہ نہ ہو تواس کی حفاظت اور تبیین و تفسیر کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا ہے۔ لہٰذا جس طرح اُمت کوامام کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح امام کو بھی وسیع علم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنافریضہ امامت ادا کرسکے۔

لہٰذا امام معصوم کا قرآن کے تمام رموزواسرار ،شریعت کے تمام احکام ومسائل اور دین کے تمام قوانین سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ دین کے بارے میں ہر قسم کے سوالوں کا جواب دے سکے۔اگر امام کا علم عام علوم جیسا ہو تواُس کے دین کے بارے میں پیدا ہونے والے وسیع شبہات واعتراضات کا جواب دینا ناممکن ہو جائے گا اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے دین وشریعت بنانے کی غرض کو نقض کرنے کے مترادف ہوگی۔رہی یہ بات کہ اگر امام کسی عام طریقے سے علم حاصل نہیں کرتااور کسی عام انسان کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کرتا تو پھر علم امام کا منبع وسرچشمہ کیا ہے؟اس سوال کے جواب میں متکلمین امامیہ نے علم امام کے جو منابع ذکر کیے ہیں وہ یہ ہیں :

ا۔قرآن مجید

علم امام کا سب سے بڑا منبع قرآن مجید اور کتاب خدا ہے۔اگرچہ قرآن کی آیات سب انسانوں کے لئے نازل ہوئی ہیں، لیکن امام اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے کتاب خدا کے وسیع علم سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ لہٰذ امام کا قرآن کے محکم ومتشابہ ،عام وخاص ، مطلق ومقید ، ناسخ ومنسوخ ،آیات کے اسباب نزول ،اور قرآنی تعلیمات کے دوسرے ضروری پہلوؤں سے آگاہ ہونا ضروری ہے چونکہ قرآن دین اور شریعت کی بنیاد اور اساس ہے جس سے مکمل آگاہی کے بغیر دین کی تفسیر و تبیین ناممکن ہے۔امام اسی قرآنی علم کے بل بوتے پر

لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور لوگوں کو آیات قرآن کے اسرار و رموز سے آگاہ فرماتا ہے۔

۲۔ پیغمبر اکرمؐ کی وراثت

امام کے علوم کا دوسرا بڑا منبع ،علوم نبوت ہیں ۔امام نبی کا جانشین ہونے کے ناطے نبی کے علوم کا بھی وارث ہوتا ہے۔تاکہ وہ نبی کی لائی ہوئی شریعت اور دین کی حفاظت ، تفسیر و تبیین اور نفاذ کا فریضہ ادا کر سکے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے علی علیہ السلام کو علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے جن سے ان کے لیے ہر باب سے ہزار باب کھل گئے۔(1)ایک اور مشہور حدیث میں پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔(2)

۳۔الہام اور فرشتگان الٰہی سے رابطہ

علم امام کا تیسرا منبع الہامات الٰہیہ ہیں جو الٰہی فرشتوں کے ذریعے یا روح القدس کے ذریعے امام کو منتقل ہوتے ہیں البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان الہامات اور وحی الٰہی میں فرق ہے ،وحی فقط انبیائے کرام سے مختص ہے ، غیر نبی کو وحی نہیں ہوتی ۔امام نبی نہیں ہوتا بلکہ نبی کا وصی اور جانشین ہوتا۔ہمارا عقیدہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ نبی اکرم ﷺ کے جانشین اور وصی ہیں جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی یعنی قرآن مجید کے محافظ ، مفسر اور مبیّن ہیں۔

جس طرح نبی اکرم ﷺ خود بھی جہاں نبی اور رسول تھے وہاں امام بھی تھے یعنی اپنی لائی ہوئی شریعت کے محافظ بھی تھے اور مبین و مفسر بھی تھے۔چونکہ آپ ﷺ کی شریعت آخری شریعت اور دین ہے جس نے تا قیامت انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کرنا ہے لہٰذا آپ ﷺ کے بعد دین و شریعت اسلام کی حفاظت و تفسیر و تبیین اور نفاذ بھی ضروری ہے۔جس کے لئے وحی و نبوت و رسالت کے علاوہ دوسری خصوصیات میں آپ ﷺ ہی جیسے جانشینوں اور اوصیاء کی ضرورت تھی۔

مکتب اہل بیت کی متعدد روایات میں ائمہ اطہارؑ کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ائمہ اطہارؑ محدّث تھے۔یعنی فرشتوں کی گفتگو سنتے تھے اور اُن سے الٰہی تعلیمات اخذ کرتے تھے۔لہٰذا امام الہام اور فرشتوں کی آواز سن کر بھی علم وآگاہی حاصل کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ یا اُس کے فرشتوں کا غیر انبیاء سے گفتگو کرنا کوئی نئی بات نہیں قرآن کی متعدد آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔(3)

امام کے وسیع علم کا لازمہ یہ ہے کہ امام دنیا کے تمام لوگوں کے ساتھ ہم کلام بھی ہوسکے اور ان کی زبان میں اُن کی ہدایت ور ہنمائی فریضہ انجام دے سکے۔اس مقالے میں اسی موضوع کے بارے میں وضاحت پیش کی گئی ہے۔اہلبیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہونے والی آیات اور منقولہ روایات، نیز اسلامی تاریخ وسیرت کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کی واضح ترین خصوصیات میں سے ایک، کائنات کے اسرار ور موز سے آگاہی اور علم لدنی اور خدادادی علوم کا حاصل ہونا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ علم کے سمندر اور اسرار الٰہی کے سرچشمے ہیں جن سے علوم ومعارف کے تشنگان سیراب ہوتے ہیں۔رسول اعظم اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ اور مولائے متقین علی ابن ابی طالب علیہ السلام علم کے وہ عظیم خزانے ہیں جنہوں نے اپنے ان اقوال "انا مدینة العلم وعلی بابھا" اور "سلونی قبل اَنْ تفقدونی" (4) کے ذریعے مذکورہ دعویٰ کی صداقت کو آشکار کیا ہے۔

معصومین علیہم السلام سے مروی متعدد روایات کے ضمن میں بعض ایسی روایات ملتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ آئمہ معصومین علیہم السلام بعض زبانوں کا علم رکھتے تھے۔اس مختصر تحریر کا مقصد ان کے اس علمی پہلو کو اجاگر کرنا ہے کہ انہیں مختلف زبانوں پر تسلط حاصل تھا اور وہ مختلف زبانوں میں گفتگو کرتے تھے۔

نبطی اور سریانی زبان:۔

نبطی سامی اقوام سے تعلق رکھتے تھے اور اسماعیلی عربوں کا ایک شعبہ تھے۔ان کی زبان کے حروف تہجی 22 تھے جو جمل کے حساب پر تھے اور وہ یہ تھے " ابجد" "ھوز" "حطی" "کلمن: سعفص اور "قرشت" عربوں نے ان حروف کے آخر میں چھ حروف بنام "روادف" کا اضافہ کیا جو کہ "ثخذ" اور "ضطغ" تھے۔(5) بہت ساری احادیث بتاتی ہیں کہ آئمہ ہدیٰ علیہم السلام نے بارہا نبطی زبان میں گفتگو فرمائی ہے۔ بطور نمونہ درج ذیل احادیث کو پیش کیا جاتا ہے۔

الف:۔جب امیر المومنین علیہ السلام اھل نہروان کے ساتھ "قطفتا" کے مقام پر ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو "بادرویا" کے لوگوں نے آپ سے گفتگو کی اور گذارش پیش کی کہ ہمارے ہمسائے میں جن کی زمینیں زیادہ ہیں اور مالیات اور ٹیکس بہت کم ہیں۔حضرت امیر المومنین علیہ السلام انہیں نبطی زبان میں جواب دیا: "رعدو رضامن عودیا" (6) اس جملے کی دو تفسیریں کی گئی ہیں:

1) ربّ دُخن صغیر خیر من دُخن کبیر۔ (7)

2) رَبّ رجز صغیر خیر من رجز کبیر۔ (8)

ب:۔ حضرت علی علیہ السلام کا ایک دن حسن بصری سے سامنا ہوا۔ وہ ایک چھوٹی نہر سے وضو کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: اے لفتی ! خوش وخرم اور تروتازہ ہو کر وضو کرو۔ حسن بصری نے کہا: تو نے کل ایسے افراد کو قتل کیا ہے جو خوش وخرم وضو کرتے تھے۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: کیا تو ان پر غمزدہ ہے؟ حسن بصری نے کہا: ہاں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے غم کو دوام عطا فرمائے۔ ایوب سجستانی کا کہنا ہے کہ میں نے حسن بصری کو جب بھی دیکھا۔
اُسے اس طرح غمگیں اور افسردہ دیکھا گویا اپنے پیارے عزیز کو دفن کرکے آرہا ہو۔ میں نے اس افسردگی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ یہ اس نیک مرد کی نفرین کا اثر ہے۔ نبطی زبان میں "لفتی" شیطان کو کہتے ہیں حسن بصری کی ماں نے اس کا یہ نام رکھا تھا اور بچپن میں اُسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس بات کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام نے اُسے اس نام سے پکارا۔ (9)

ج:۔ عمار ساباطی نے بیان کیا ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے نبطی زبان میں مجھ سے فرمایا: "ابومسلم فطلّله وکسا وکسیحه بساطورا" عمار ساباطی کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا کہ میں نے کسی نبطی کو بھی نبطی زبان میں اس طرح فصیح انداز سے گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس طرح آپ نے گفتگو کی ہے۔ آپ نے فرمایا: اے عمار ہر زبان میں ایسا ہی ہے۔ (10)

د:۔ ابو بصیر کہتے ہی کہ بابل کے ایک باشندے نے مجھے نقل کیا ہے کہ ہمارے گاؤں میں ایک شخص مجھے تنگ کرتا تھا اور کہتا تھا۔ اے رافضی ! اور گالیاں دیتا تھا۔ گاؤں کا لنگور اس کا لقب پڑ گیا تھا۔ میں نے ایک سال حج ادا کیا اور امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے ابتداء میں (نبطی زبان میں) فرمایا: "قوفه مانامت" یعنی لنگور مر گیا ہے۔ میں نے عرض کیا قربان جاؤں کب مرا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ابھی مرا ہے۔ میں نے دن اور وقت نوٹ کر لیا۔ جب میں کوفہ پہنچا تو میری اپنے بھائی سے ملاقات ہو گئی میں نے اس سے مرنے کا وقت پوچھا؟ اس نے بتایا فلاں دن اور فلاں وقت۔ یہ وہی وقت اور دن تھا جس کی امام صادق علیہ السلام نے خبر دی تھی۔

ھ:۔ عبدالحمید جرجانی بیان کرتے ہیں: ایک غلام میرے پاس اجمہ (ایک قسم کے پرندے) کے انڈے لے کر آیا میں نے انہیں مختلف قسم کا پایا میں نے اس سے پوچھا یہ کس چیز کے انڈے ہیں؟ اس نے کہا "دیوك الماء" کے انڈے ہیں۔ میں نے انہیں کھانا پسند نہیں کیا اور اپنے آپ سے کہا جب تک امام صادق علیہ السلام سے نہ پوچھ لوں انہیں نہیں کھاؤں گا۔

آخر کار میں مدینے میں داخل ہوا اور حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ سے چند مسئلے پوچھے لیکن وہ مسئلہ پوچھنا بھول گیا۔ جب مدینے سے کوچ کرنے والا تھا۔ تو اچانک وہ مسئلہ مجھے یاد آگیا۔ اس کے باوجود کہ اونٹوں کی مہار میرے ہاتھوں میں تھی انہیں میں نے اپنے بعض ساتھیوں کے سپرد کیا اور امام صادق علیہ السلام کی طرف دوڑا ان کے پاس لوگوں کا رش تھا، میں ان کے گھر میں داخل ہوا اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپؑ نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا اے عبدالحمید: "لناتاتی دیوك هبر" میں نے عرض کیا جو میں چاہتا تھا اس کا جواب آپؑ نے دے دیا۔ اس کے بعد میں واپس ہوا اور اپنے ساتھیوں سے آکر مل گیا۔ (11)

و:۔ دوین کے علاقے کے ایک باشندے نے کہا کہ میں امام صادق علیہ السلام سے "دیوك الماء" کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا: "یابت دعانا میتا بناحل" یہ اُسی شخص کی زبان کا جملہ ہے "یابت" کا مطلب بیض یعنی انڈے، "دعانا میتا" کا مطلب دیوك الماء اور بناحل کا معنی نہ کھاؤ۔ پس پورے جملے کا مطلب یوں ہوا۔ دیوك الماء کے انڈے نہ کھاؤ۔ (12)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: حضرت نوح علیہ السلام نے تمام حیوانات سے ایک ایک جوڑے کو کشتی میں سوار کرنے لگے تو گدھے کے پاس آئے لیکن گدھا نے ضد کی اور سوار نہیں ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کھجور کے درخت کی ایک چھڑی لے کر اُسے ماری اور کہا "عبساشاطانا" یعنی اے شیطان سوار ہو جا۔ (13)

ایک یہودی نے اپنی قبا کے اندر سے ایک تحریر نکالی اور امیر المومنین علیہ السلام کو دی، آپؑ نے اس تحریر کو کھولا اُسے دیکھا اور گریہ کیا۔ یہودی نے پوچھا آپؑ کو کس چیز نے رُلایا ہے؟ آپؑ نے اس تحریر کو دیکھا ہے جو کہ سریانی زبان میں ہے جبکہ آپؑ کی زبان عربی ہے کیا آپؑ جانتے ہیں یہ کیا لکھا ہے؟ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: ہاں جانتا ہوں۔ یہ میرا نام ہے جو یہاں مذکور ہے، یہودی نے کہا اپنا نام مجھے دکھائیں اور بتائیں کہ سریانی میں آپؑ کا نام کیا ہے؟ آپؑ نے اس تحریر میں اپنا نام اُسے دکھایا اور فرمایا: میرا نام سریانی زبان میں "الیا" ہے اس وقت یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا:

"اشهدان لا اله الا الله واشهدان محمدًا رسول الله واشهدانك وصی محمد واشهد انك اولی النّاس بالنّاس بعد محمد (صلی الله علیه وآله)۔ اس کے ساتھ یہودی کے ساتھ جو لوگ تھے انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی۔" (14)

ہندی زبان:۔

1۔ابو ہاشم جعفری بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے میرے ساتھ ہندی زبان میں گفتگو کی میں ان کا اچھے طریقے سے جواب نہ دے سکا آپ کے سامنے چمڑے کے تھیلی پڑی تھی جو سنگریزوں سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے ان میں سے ایک اپنے منہ میں رکھا، اسے اچھی طرح چوسا اور پھر میرے منہ میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قسم میں ابھی ان کی بارگاہ سے نہیں اٹھا تھا کہ تہتر (73) زبانوں میں گفتگو کرنے کی صلاحیت مجھے حاصل ہو گئی جن میں پہلی زبان ہندی تھی۔ (15)

2۔علامہ مجلسیؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص امام زمانہ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اس شخص نے ملاقات کے بعد یوں ماجرہ بیان کیا۔ میں نے اچانک اپنے مولا کو تشریف فرما دیکھا جب انہوں نے مجھے دیکھا تو مجھے سلام کیا مجھ سے ہندی زبان میں گفتگو فرمائی میرا نام لیا اور چالیس افراد کا ان کے ناموں کے ساتھ حال احوال پوچھا۔ (16)

سندھی زبان:۔

1۔ جاثلیق نے امام رضا علیہ السلام سے کہا: اے محمدؐ کے بیٹے: یہاں پر ایک سندھی عیسائی ہے جو سندھی زبان میں مناظرہ کرتا ہے اور دلائل پیش کرتا ہے۔ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا اُسے میرے پاس لائیں۔ اُسے آپؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپؑ نے اس سے سندھی زبان میں کلام کیا۔ اور پھر اُس سے سندھی میں بحث ومباحثہ شروع کیا اور اُسے نصرانیت میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک گھمایا۔ آخرکار ہم نے سنا کہ سندھی شخص کہہ رہا تھا "ثبطی ثبطلله" امام رضا علیہ السلام نے فرمایا اس نے سندھی زبان میں توحید کا اقرار کیا ہے۔ اس کے بعد اس سے آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کے بارے میں گفتگو کی اور اُسے بتدریج مرحلہ بہ مرحلہ اپنے مقصد کی طرف لے آئے۔

یہاںتک کہ اُس نے سندھی زبان کہا: اشھدان لا الہ الا اللہ وان محمدًا رسول اللہ۔اس کے بعد اس نے اپنا کمر بند اٹھایا تو اس کا زنّار جو اُس کے کمر بند کے نیچے تھا نظر آنے لگا۔ اس نے کہا اے رسولؐ خدا کے فرزندؑ اس زنّار کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ دیں امام رضاعلیہ السلام نے چاقو منگوایا اور اُسے کاٹ دیا پھر آپؑ نے محمد بن فضل ہاشمی سے فرمایا: اس سندھی کو حمام لے جاؤاِسے پاک کرو لباس پہناؤاور اس کو گھر والوں کے ساتھ مدینے لے جاؤ۔(17)(18)

2۔ابواسماعیل سندھی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ہندوستان میں سنا کہ اللہ تعالیٰ کی عربوں میں ایک حجت ہے میں نے اس حجت کی تلاش میں ہندوستان سے رخت سفر باندھا میری امام رضاعلیہ السلام کی طرف راہنمائی کی گئی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ میری حالت یہ تھی کہ میں عربی زبان کا ایک لفظ بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے ان کو سندھی زبان میں سلام کیاانہوں نے سندھی زبان میں ہی میرے سلام کا جواب دیا میں نے اپنی زبان میں ان سے گفتگو شروع کی آپؑ نے سندھی میں میرے جوابات دیئے میں نے ان سے کہا میں نے سندھ کی سرزمین پر سنا ہے کہ عربوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی ایک حجت ہے میں اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ انہوں نے سندھی میں جواب دیا اور فرمایا: ہاں وہ حجت میں ہوں جو تم پوچھنا چاہتے ہو پوچھو۔ میں جو چیزیں پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے دریافت کیں اس کے بعد میں ان کی خدمت سے رخصت ہونا چاہا تو میں نے عرض کی کہ مجھے عربی اچھی طرح نہیں آتی آپؑ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے الہام فرمائے تاکہ میں عربوں کے ساتھ عربی زبان میں بات کرسکوں۔انہوں نے اپنادست مبارک میرے لبوں پر لگایا اسی وقت سے میں عربی زبان میں گفتگو کرنے لگا ہوں۔(19)

اہل نوبہ کی زبان:۔

امام رضاعلیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ میرے والد نے حسین بن ابی علاء سے فرمایا: میرے لیے ایک نوبی کنیز خرید کر لاؤ۔ حسین بن ابی علاء نے کہا: خدا کی قسم میں ایک ارجمند نوبی کو جانتا ہوں اس سے اچھی کنیز نابیوں میں میں نے نہیں دیکھی اگر اس میں ایک صفت نہ ہوتی، وہ آپ کے پاس لانے کے قابل تھی۔ آپ نے پوچھا۔ وہ کونسی صفت ہے؟ حسین بن ابی علاء نے کہا وہ آپؑ کی بات کو نہیں سمجھتی اور آپؑ اس کی زبان نہیں جانتے حضرت مسکرائے اور فرمایا: جاؤاور اُسے خرید لاؤ۔

حسین ابی علاء نے کہا جب میں اُس کنیز کو امام علیہ السلام کی خدمت میں لے آیا تو آپؑ نے اس سے اھل نوبہ کی زبان میں اس کا نام پوچھا اُس نے کہا: مونسہ آپؑ نے فرمایا: مجھے اپنی جان کی قسم ہے تو مونسہ ہے اور اس کے علاوہ تیرا کوئی اور نام نہیں ہے۔ اس سے پہلے تیرا نام حبیبہ تھا۔ اس نے کہا آپؑ سچ کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپؑ نے حسین بن ابی علاء سے فرمایا: بے شک اس کنیز سے میرا ایک بیٹا پیدا ہوگا جو میرے بیٹوں میں سے زیادہ سخی، شجاع اور دعاومناجات کرنے والا ہوگا۔ حسین بن ابی علاء نے پوچھا اس بیٹے کا کیا نام رکھیں گے تاکہ میں اُسے جان لوں۔ آپ نے فرمایا: ابراہیم۔ (20)

زطّی زبان:۔

جنگ جمل سے فراغت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے پاس "زط" سے ستر (70) افراد حاضر ہوئے انہوں نے آپ کو سلام کیا اور اپنی زبان میں آپ سے بات کی۔ حضرت علی علیہ السلام نے انہی کی زبان میں سلام کا جواب دیا اور فرمایا: جس طرح تم نے کہا ہے میں اس طرح نہیں ہوں میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور بندہ ہوں، انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا تو وہی ہے (یعنی تو خدا ہے) حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اگر تم اس عقیدے سے دستبردار نہ ہوئے اور اپنے کہنے پر بارگاہ الٰہی میں توبہ نہ کی تو تمہیں قتل کردوں گا۔ انہوں نے بات نہ مانی اور توبہ نہ کی۔ اس وقت آپؑ نے ان کے لیے ایک گڑھے کھودنے کا حکم دیا۔ گڑھے کھودے گئے اس وقت آپؑ نے ان گڑھوں کے درمیان سوراخ کرنے کا حکم دیا۔ انہیں ان گڑھوں میں پھینک دیا گیا اور اوپر انہیں بند کر دیا گیا ان گڑھوں میں سے ایک خالی گڑھے میں آگ جلائی گئی اور وہ سب دھویں سے دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے۔ (21)

یونانی زبان:۔

بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے آئمہ علیہم السلام کو یونانی زبان پر بھی تسلط حاصل تھا۔ ان میں سے ایک روایت جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا: اے مفضّل! یونانی زبان میں اس دنیا کا نام جو ان کے درمیان مشہور ہے، " قوسموس" ہے جس کا معنی زیور ہے۔ فلاسفہ اور حکمت کے دعویداروں نے دنیا کا یہ نام رکھا ہے۔ امام زمان علیہ السلام سے منقول ایک خط میں یوں خطاب کیا گیا ہے۔ "المترجم بالیونانی" اگر یہ اسم فاعل ہو تو اس سے مراد یونانی زبان میں ترجمہ کرنے والا ہے۔ (22)

عبرانی زبان:۔

ہارونی نے عبرانی زبان میں لکھی ہوئی ایک تحریر اپنی آستین سے نکالی اور حضرت علی علیہ السلام کے سپرد کی۔آپؑ نے اس تحریر کو دیکھا اور گریہ فرمایا۔ہارونی نے آپؑ سے سوال کیا کس چیز نے آپؑ کو رُلایا ہے؟آپؑ نے جواب دیا۔اے ہارونی اس میں میرا نام مذکور ہے۔اس نے کہا یہ تحریر عبرانی زبان میں ہے جبکہ آپؑ عرب ہیں۔آپؑ نے فرمایا: اے ہارونی تعجب کرتے ہو یہ میرا نام ہے، تورات میں میرا نام "ہابیل"اور انجیل میں "حبدار" ہے۔اس وقت ہارونی نے آپ سے عرض کیاآپؑ نے سچ فرمایا ہے۔مجھے اس خداکے قسم ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں یہ میرے باپ ہارون کی تحریر ہے جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی زبان میں لکھی گئی ہے میرے.بزرگوں نے اس تحریر کو اپنے ارث میں پایا ہے اور اب یہ مجھ تک پہنچی ہے۔(23)

عامر بن علی جامعی کا بیان ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا۔میری جان آپؑ پر قربان ہو۔ہم اہل کتاب کے ہاتھوں ذبح شدہ جانوروں کو کھاتے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں یا نہیں؟آپؑ نے فرمایا جب آپ اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرتے ہوئے سنیں تو ان کا گوشت کھائیں۔کیا تم جانتے ہو کہ جانوروں کو ذبح کرتے وقت وہ کیا کہتے ہیں؟میں نے نہیں میں جواب دیا۔آپ نے ایک یہودی کی طرح جلدی سے کچھ پڑھا اور فرمایاانہیں اس طرح پڑھنے کا حکم دیا گیاہے۔میں نے کہا آپ پر قربان جاؤں اگر اجازت دیں تو میں لکھ لوں؟آپؐ نے فرمایا لکھو:" نوح ایوا ادینوا یلھیز مالحوا عالم اشرسوا او رضوبنویوسعه موسق دغال اسطحوا"(24)

رومی زبان:۔

1) امیر المومنین علیہ السلام نے ایک آدمی کے سوال کا جواب رومی زبان میں دیا۔(25)

2) امام سجاد علیہ السلام نے زندان کی دیوار پر رومی زبان میں تحریر کو پڑھا۔(26)

3) امام موسیٰ بن جعفر صادق علیہ السلام نے رومیوں سے رومی زبان میں گفتگو فرمائی۔(27)

4) امام رضا علیہ السلام رومی کنیز سے اس کی اپنی زبان میں ہم کلام ہوئے۔(28)

5) امام نقی علیہ السلام رومی زبان میں خط لکھتے تھے۔(29)

6) امام سجاد علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا ہمیں زندان میں لے جایا گیا میرے ساتھیوں نے کہا اس دیوار کی بناوٹ کتنی اچھی ہے۔رومیوں نے اپنی زبان میں ایک دوسرے

سے کہا: اگر اس گروہ کے درمیان خون کا وارث موجود ہو تو وہ وہ ہے۔ان کی مراد میں تھا۔اس کے بعد ہم دو دن تک زندان میں رہے پھر ہمیں بلایا گیا اور رہا کر دیا گیا۔(30)

7) یاسر جو کہ امام رضا علیہ السلام کا خادم تھا، اس کا کہنا ہے کہ امام رضا علیہ السلام کے گھر میں صقلبی اور رومی غلام موجود تھے آپ ان کے قریب تھے۔ رات کو سنا کہ وہ صقلبی اور رومی زبان میں آپس باتیں کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم ہر سال اپنے وطن میں فصد نکلواتے تھے لیکن یہاں ہم نے فصد نہیں نکلوایا۔جب رات گزر گئی اور دن چڑھا تو امام رضا علیہ السلام نے طبیب کو بلایا اور اس سے فرمایا: فلاں غلام کی اس رگ سے فصد نکالو اور اس کی فلاں رگ سے۔(31)

افریقی/ حبشی زبان:۔

ابن حمزہ سے روایت ہے کہ میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں تھا۔اتنے میں آپ کی خدمت میں حبشہ سے خریدے گئے تیس (32) غلام لائے گئے۔ان میں ایک خوبصورت گفتگو کرنے والا تھا، اس نے گفتگو کی، ساتویں امامؑ نے حبشی زبان میں اسے جواب دیا وہ غلام حیران رہ گیا، باقی غلام بھی تعجب کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ امام علیہ السلام ان کی باتیں نہیں سمجھتے۔امام علیہ السلام نے اس ایک غلام سے فرمایا: میں کچھ رقم تمہارے حوالے کرتا ہوں تو اس میں سے ہر غلام کو تیس درہم ادا کرو۔غلام باہر چلے گئے ان میں بعض ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ آپ تو ہماری زبان میں ہم سے بھی زیادہ فصیح ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے نعمت ہے۔

علی بن حمزہ کہتے ہیں جب غلام سب باہر چلے گئے میں نے عرض کیا اے رسولؐ اللہ ﷺ کے فرزندؑ! میں نے دیکھا ہے کہ آپؑ حبشیوں کے ساتھ انہی کی زبان میں گفتگو فرما رہے تھے آپؑ نے جواب دیا ہاں۔ میں نے پھر عرض کیا کہ آپؑ نے صرف اس غلام کو حکم دیا ہے۔ فرمایا: ہاں، میں نے اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر مہینے انہیں تیس درہم دینے کا کہا ہے۔اس کی گفتگو کے انداز سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ان سب سے زیادہ سمجھدار ہے وہ سرداروں کا بیٹا ہے اس لیے میں نے اسے دوسروں پر مقرر کیا ہے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی تاکید کی ہے۔

اس کے علاوہ وہ ایک راست پیشہ غلام ہے پھر آپؑ نے فرمایا شاید تم اس بات پر حیران ہوئے ہو کہ میں نے ان سے حبشی زبان میں کلام کیا ہے؟ میں نے کہا خدا کی قسم ایسا ہی ہے۔آپؑ نے فرمایا۔ تعجب نہ کرو

جو چیز میرے کاموں میں سے تم پر پوشیدہ ہے وہ اس سے کہیں زیادہ حیران کن اور باعث تعجب ہے جو کچھ تم نے سنا وہ نہیں ہے مگر ایک پرندہ کی طرح جو سمندر سے اپنی چونچ میں پانی کا ایک قطرہ حاصل کرے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک قطرہ لینے سے سمندر کا پانی کم ہو جاتا ہے؟ امام کی مثال سمندر کی طرح ہے جو کچھ اس کے پاس ہے ختم ہونے والا نہیں اور اس کے عجائب سمندر سے کہیں زیادہ ہیں۔

ترکی زبان:۔

ابن فرقد بیان کرتے ہیں کہ میں امام صادق علیہ السلام کے پاس تھا اتنے میں ایک غیر عربی غلام پیغام لے کر آیا جس کا تلفظ وہ مشکل سے ادا کر رہا تھا اور اُسے صحیح بیان نہیں کر رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ الفاظ کو صحیح تلفظ نہیں کر سکتا۔ امام علیہ السلام نے اُسے فرمایا چونکہ تم صحیح طرح عربی نہیں بول سکتے ہو لہٰذا جس زبان میں چاہو بات کر سکتے ہو، میں ترکی زبان جانتا ہوں۔ اس نے ترکی زبان میں بات کی امام علیہ السلام نے اُسے جواب دیا وہ حیرت زدہ وہاں سے رخصت ہوا۔ (33)

ابو ہاشم جعفری کہتے ہیں، میں مدینے میں تھا، یہاں تک کہ الواثق کے دور میں "بغا" (ترک کمانڈروں میں سے ایک) کا مدینے سے گذر ہوا وہ چند عربوں کو تلاش کرنے کے لیے آیا تھا۔ امام نقی علیہ السلام نے فرمایا مجھے باہر لے جاؤ تاکہ میں اس کے لشکر کا سرسری فرد دیکھوں۔ ہم باہر آئے اور کھڑے ہو گئے اس کی فوج گذر گئی ایک ترکی شخص سے ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔

امام علیہ السلام نے اس سے ترکی زبان میں بات کی وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترا اور امام علیہ السلام کے گھوڑے کے سم کو بوسہ دیا۔ میں نے اس ترکی کو قسم دی کہ وہ بتائے کہ امام علیہ السلام نے اس سے کیا کہا ہے۔ ترکی شخص نے مجھ سے پوچھا یہ شخص پیغمبر ہے؟ میں نے کہا: نہیں، اس نے کہا اس نے مجھے ایسے نام سے پکارا ہے جو میرے وطن میں مجھے بچپن سے پکارا جاتا تھا اور آج تک کسی کو اس کی اطلاع نہیں تھی۔ (34)

صقلبی زبان:۔

علی بن مھزیار نقل کرتے ہیں کہ میرا غلام صقلابی تھا اُسے میں نے امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا تو وہ حیران و پریشان واپس آیا میں نے کہا تمہیں کیا ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا میں کیوں حیرت زدہ نہ ہوں امام علیہ السلام نے میرے ساتھ مسلسل صقلابی زبان میں باتیں کیں گویا وہ ہمارے ہی ایک فرد

ہیں۔ میرا گمان یہ تھا کہ آپ نے اس زبان میں اس لیے گفتگو فرمائی تاکہ دوسرے غلام نہ سن سکیں۔(35)

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے بیٹے چند روز دکھائی نہیں دیئے ایک دن اسحاق اپنے بھائی محمد کے ساتھ امام علیہ السلام کے پاس آئے آپ عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک صقلابی آیا۔امام علیہ السلام نے اس سے صقلابی میں گفتگو کی۔(36)

حوالہ جات

1۔بصائر الدرجات، ص302۔ بحار الانوار، ج26، ص29

2۔ کنزل العمال، ج13، ص148۔ جامع الحدیث السیوطی، ج16، ص209

3۔ محمد سعیدی فر، آموزش کلام اسلامی، ج۲، مطبوعہ قم

4۔ ر.ک: نہج البلاغہ، خطبہ 189

5۔ علی سامی، تمدّن ہخامنشی، ص111

6۔ محمد بن الحسن (ابو جعفر) الصّفار القمی، بصائر الدرجات، ص 335 یا 355/ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، ج 41، ص289

7۔ دخن ایک قسم کے غلہ کو کہتے ہیں۔

8۔ رجز سے مراد ایک قسم کا موٹا گوسفند اور دنبہ ہے اور رجز سے مراد جڑی بوٹی سے خالی زمین بھی ہے۔

9۔ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، ج41، ص302 و ج42، ص143

10۔بصائر الدرجات، ص333 یا353/بحار الانوار، ج26، ص191

11۔ قطب الدّین راوندی، الخرائج والجرائح، ج2، ص630/بحار الانوار، ج47، ص105

12۔ بحار الانوار، ج 47، ص 81-دیوک الماء سے مراد پانی کے ایسے پرندے کہ جو حلال کوشت پرندوں کی خصوصیات نہیں رکھتے۔

13۔بصائر الدرجات، ص335 یا355

14۔ بحار الانوار، ج38، ص61 و ج40، ص289/ج50، ص136/ج52، ص29/ج49، ص78

15۔ بحار الانوار، ج38، ص61 و ج40، ص289/ج50، ص136/ج52، ص29/ج49، ص78

16۔ بحار الانوار، ج38، ص61 و ج40، ص289/ج50، ص136/ج52، ص29/ج49، ص78

17۔ بحارالانوار، ج38، ص61 وج40، ص289/ج50، ص136/ج52، ص29/ج49، ص78

18۔ سید ہاشم بحرانی، مدینۃ المعاجز (یک جلدی)، ص511 وج7، ص236/بحارالانوار، ج49، ص50

19۔ بحارالانوار، ج48، ص69

20۔ فروع الکافی، ج7، ص257/بحارالانوار، ج40، ص301

21۔ بحارالانوار، ج3، ص146/ج91، ص28/ج36، ص222

22۔ بحارالانوار، ج3، ص146/ج91، ص28/ج36، ص222

23۔ بحارالانوار، ج3، ص146/ج91، ص28/ج36، ص222

24۔ بصائرالدرجات، ص334 یا354

25۔ بحارالانوار، ج40، ص171/ج46، ص72/ج49، ص80/ج49، ص78/ج51، ص6/ج45، ص177/ج26، ص192

26۔ ایضا

27۔ ایضا

28۔ ایضا

29۔ ایضا

30۔ ایضا

31۔ ایضا

32۔ بحارالانوار، ج48، ص70 وج48، ص100 وج26، ص190

33۔ الخرائج والجرائح، ج2، ص759/بحارالانوار، ج47، ص119

34۔ بحارالانوار، ج50، ص124

35۔ ہمان، ج26، ص191 و نیز بصائرالدرجات، ص333 یا353

36۔ ہمان، ج48، ص56

ایک آسمانی شہر کی سیاحت

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین *

Sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی الفاظ:

آسمانی شہر، دیومالائی شہر، سیاحت، سفر نامہ، مدینۂ فاضلہ، آٹوپیا، حکمت، عدالت، ایثار، عشق، امام حسینؑ

خلاصہ

اس مقالہ میں ایک آسمانی شہر کی سیاحت کا سفر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل، اس سفر نامے میں مصنف نے قدیم وجدید فلاسفرز کے مدینۂ فاضلہ یا آٹوپیا کے تصوّر اور افسانہ نگاروں کے دیومالائی شہر کے تخیل کے واقعی وجود کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آج کی دنیا میں ہمارے اِس کرۂ خاکی پر نہ تنہا اِس ترقی یافتہ انسانی سماج کا قیام ممکن، بلکہ اس سے بھی بہتر، ایک آسمانی شہر کا قیام تحقق پذیر ہے۔ لہٰذا اِس سفر نامے کا دعوی یہ ہے کہ اس کے مصنّف نے ایسے ہی آسمانی شہر کا زمینی نمونہ کشف کیا ہے۔

اس داستان میں جو کہ تخیلات سے زیادہ حقائق پر مبنی ہے، مذکورہ آسمانی شہر کے اعلی سماجی نمونوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، اس کا مدینۂ فاضلہ کے تصور کے ساتھ مقایسہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز عصر حاضر کے فلاسفرز اور ماہرین سیاست و اخلاق اور سماج دوستوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس محیر العقول ترقی یافتہ انسانی جمہور یا بشری سماج کی شہریت حاصل کریں اور اس سلطنتِ عشق کی سرحدوں میں وسعت لانے میں اپنا کردار ادا کریں تاکہ وہ اپنی گم گشتہ متاع پا سکیں۔

*۔ ڈائریکٹر نور الہدی مرکز تحقیقات، استاد اصول و فقہ و فلسفۂ اسلامی، جامعۃ الرضا، بارہ کہو، اسلام آباد۔

عرشی، فرشیوں کے مہمان

جب ہم اپنے کرۂ خاکی کے دینداری اور نظام مملکت داری کے لحاظ ایک بہترین شہر کی حدود سے نکلے تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا ہم ایک آسمانی شہر کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ لیکن میرے وہم و گمان میں ہو یا نہ ہو، بہر صورت، ہم ایک آسمانی شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اس امر کا سب سے پہلا اشارہ یہ تھا کہ اُس پار کی بارڈر پر ہمارے خاکی سیارے کے ممالک کے امیگریشن نظام کے عام عرف سے بالکل برعکس نہ کوئی ویزا، نہ ویزا فیس اور نہ ہی کوئی انٹری تھی۔ آسمانی شہر کی سرحد پر آنے والے مسافروں کے لیے اس سے بڑا سائن بورڈ اور کیا لگایا جا سکتا تھا۔

ہو سکتا ہے کوئی مسافر اس سائن بورڈ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا ہو، لیکن جب تک تجاہلِ عارفانہ جیسے سنگین جرم کا ارتکاب نہ کر لیا جائے، اِس واقعہ کو معمولی وقوعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے خاکی کرہ پر سیاحت (Tourism) حکومتوں کے لیے ایک انتہائی منافع بخش صنعت ہے۔ عام طور پر جن ممالک کا بیرونی سیاح کثرت سے سفر کرتے ہیں، وہ فقط ویزا دینے پر اتنا کچھ کما لیتے ہیں کہ جس سے نہ تنہا اُن کے بیرونِ ممالک سفارتخانوں کا سارا خرچہ نکل آتا ہے، بلکہ کافی مقدار میں زرِ مبادلہ بچ بھی جاتا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری اپنی دھرتی پر جہاں میزبان ممالک ''بیت اللہ'' یا ''مقامات مقدسہ'' کو اپنی ملکی میراث سمجھ کر اُن کی سیاحت (جسے شرعی اصطلاح میں حج و عمرہ اور زیارت کا نام دیا جاتا ہے) کے لیے جانے والے مسافروں سے ہوشربا ویزا فیس اور دیگر ٹیکس وصول کرتے ہیں، وہاں ڈیپارچر پر ہر مسافر سے اُس کا اپنا ملک بھی کسی نہ کسی فرضی عنوان کے تحت ضرور بھتا وصول کر لیتا ہے۔ بہر صورت، ہمارے فرشی نظام میں عبادت پر بھی سیاحت کے چارجز وصول کیے جاتے ہیں۔ لیکن جس عرشی شہر کی سیاحت کی میں بات کر رہا ہوں، اُس کے ارباب بست و کشاد کی سوچ ایسی نہ تھی۔ لہٰذا لاکھوں تو کجا، کروڑوں سیاحوں سے کوئی ویزا فیس وصول نہ کی گئی!!

خیر! یہ تو ہمارے ذرائع ابلاغ کی منافقت اور استحصالی نظاموں کی غلامی اور اُن سے وابستگی کا کھلا ثبوت ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی روئیداد کو محض اس لیے اتنی سادگی اور بے نیازی سے نظر انداز کر دیا کہ مبادا اُن

کے کرم فرما ناراض نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ زمینی مواصلاتی نظام کو آسمانی شہر کی بارڈر کی یہ خبر وصول ہونے کے باوجود، اس خبر کو دنیا کی تبلیغات ادبیات میں کہیں شہ سرخی کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس تعجب برانگیز روئیداد کو اپنی بشری طبیعت کے تقاضوں کے عین مطابق طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیا اور بہت سارے تو ویسے بھی غافلین کی صف میں شمار ہوتے ہیں جو آنکھیں رکھنے کے باوجود دیکھتے نہیں اور کان ہونے کے باوجود سنتے نہیں۔

آسمانی شہر کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد ایک زمینی مخلوق کے ناطے میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ ہمیں اپنی اگلی منزل تک پہنچانے کے لیے بہت جلد کسی اچھی اے. سی. گاڑی کا انتظام کر دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ دراصل، آسمانی شہر کی بارڈر پر زمینی باشندوں کو لینے آنے والی کوچز، اپنی تمامتر بہتات کے باوجود کم پڑ گئی تھیں۔ لہٰذا جو براق میسّر آتی، ترجیحی بنیادوں پر اُس پر بچوں اور لیڈیز جیسے فرشتوں اور حوروں کو بٹھا دیا جاتا۔ باقی رہے مجھ جیسے گنہگار بشر، تو انہیں اِس مقدس وادی میں داخل ہونے کے لیے برزخ نما صحرا کے سفر کی چند مزید سختیاں جھیل کر اپنے گناہوں سے طہارت حاصل کرنا تھی۔ لہٰذا ہمیں کوئی گاڑی میسر نہ آسکی۔ ہاں گڈز ٹرانسپورٹیشن کے لیے استعمال میں لایا جانے والا ایک [ٹبر گھیل] بہت لمبا ساٹریلر ضرور میسر ہو گیا۔

ٹریلر پر اتنے کمال کارَش لگا کہ تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہی۔ زمینی مخلوق کے ناطے مجھے یہ حق پہنچتا تھا کہ میں یہ سوچوں کہ اب ڈرائیور کے وارے نیارے ہو گئے۔ کیونکہ وہ ہماری بشری مجبوری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اتنا کرایہ وصول کرے گا کہ کم از کم ۱۰ دن کی دھاڑی ایک ہی دن بنا لے گا۔ میں ایسا سوچنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ کیونکہ جس انسانی سماج سے میرا تعلق تھا، اس میں بالکل یہی فارمولا چلتا تھا۔ لیکن تعجب تو اس بات پے ہے کہ لگ بھگ پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہمیں اتار کر ڈرائیور کرایہ وصول کرنے کی بجائے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس عاجزی سے چل دیا کہ گویا ہم نے اُس کے دلدل میں پھنسے ٹریلر کو دھکا لگا کر اس کی مشکل آسان کر دی ہو۔

جس سڑک پر ہم اترے، اُس کے کنارے ہوٹل نما ایک خیمہ لگا تھا جس میں وہ چائے پلائی جا رہی تھی جسے میں تھکاوٹ یا سردَرد میں ''شراباً طہوراً'' کہہ دیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی کم و بیش ۲۴ گھنٹے کے سفر کی تھکاوٹ کے بعد اگر چائے کی گرما گرم پیالی میسّر آجائے تو کیا اس غیر مترقبہ نعمت کو ''شراباً طہوراً'' کہہ

دینا کوئی گناہ ہے؟ میں نہیں مانتا کہ ایسا فتوی لگایا جاسکے۔ بالخصوص جب ساقی التجا کے انداز میں یہ شراب آپ کے ہاتھ میں بغیر کوئی قیمت وصول کیے تھمارہا ہو۔

خیر ! اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے کسی گاڑی کی تلاش ہماری پہلی ترجیح تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ ابھی کوئی ڈیرھ دو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل چل کر ''گراج'' تک پہنچنا ہوگا۔ لہٰذا ہم نے زمین پر اپنے لیے گناہوں کا جتنا بوجھ آمادہ کیا تھا اُسے پیٹھ پر اٹھائے، چلتے، رینگتے ''گراج'' تک پہنچ ہی گئے۔ لیکن یہاں بھی ہمیں منزل مقصود تک لے جانے کے لیے کوئی گاڑی میسر نہ تھی۔ شاید ہمارے مقدّر میں ٹریلر ہی لکھے تھے۔ اللہ اللہ کرکے ایک ٹریلر میسر آیا یا ہم ٹریلر کو میسر آگئے۔ دوسری شقّ میں زیادہ وزن محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ لگ یہی رہا تھا کہ کئی مہینوں سے بیچارے اِس ٹریلر پر کسی نے کوئی سامان نہیں لادا۔ اُس کی لوہے کی اندورنی دیواروں پر ایسا زنگ لگا تھا جس ہمارے استری شدہ صاف و شفاف کپڑے یا اجلے اجلے بیگ ہی اتار سکتے تھے۔

لیکن ہماری مشکل اُس وقت دوچنداں ہو گئی جب اہلِ زمین کو آسمانی شہر کے ڈرائیور کی زبان ہی سمجھ نہ آ سکی۔ تمام مترجمین کے اجتماعی ترجمہ سے بس اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ صاحب ہمیں ۵ کلومیٹر کے فاصلے تک لے جائیں گے جہاں سے بس میسر ہو جائے گی۔ لیکن جب لگ بھگ ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تو مجبورا یہ تصحیح کرنا پڑی کہ متن میں ۵۰ کلومیٹر لکھا تھا جسے مترجمین نے سہواً ۵ کلومیٹر ترجمہ کر ڈالا ہے۔ اب کیا کر سکتے تھے۔ ترجمہ ٹھیک ہو یا غلط، ۵۰ کلومیٹر، ۵۰ کلومیٹر ہی رہتے ہیں:

چشم معنی آشنا میں ہے مقام ان کا وہی　　سہو کاتب سے مقدم ہوں مؤخر سینکڑوں

اس سفر میں ٹریلر کی تیز رفتاری اور اس کے جانشینوں کا گرنا، سنبھلنا، چیخنا، چلانا بھی یادگار ہے۔ گویا یہ روڈ پر نہیں، ہَوا کے دوش پر اڑ رہا تھا۔ میں تو مرحوم علامہ اقبال کے سفرِ حجاز کی خیالی داستاں بنا اِس ٹریلر کو اونٹنی قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال ہی کے الفاظ میں یہ التجا کر رہا تھا کہ:

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو　　کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است

یعنی: [سفر کے دوران] ''سحر [کے وقت] میں نے اپنی اونٹنی سے
کہا کہ آہستہ چلو ! کیونکہ تمہارا سوار تھکا ہارا، بیمار اور بوڑھا ہے!''

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ میں نے لوہے اور پلاسٹک کے کَل پرزوں سے اسمبل شدہ، ڈیزل کی گردش پر بھاگتی اونٹنی کا وہی ردّ عمل دیکھا جو حکیم الامّت نے گوشت پوست سے بنی، خون کی گردش پر چلنے والی اونٹنی سے دیکھا تھا۔ یعنی:

قدم مستانہ زد چندان کہ گوئی　　بپایش ریگ این صحرا حریر است

یعنی: ''اونٹنی نے تو یوں مستانہ وار قدم مزید آگے بڑھا دیے
کہ جیسے اُس کے قدموں میں اس صحرا کی ریت، ریشم ہو۔''

خیر! غروب آفتاب سے کوئی آدھ گھنٹہ قبل لوہے کے اِس سفینے نے اللہ کے گھر کے سامنے لنگر ڈالا۔ سب اترے اور اپنا اپنا سامان مسجد میں رکھ دیا۔ جن لوگوں نے ہنوز نماز عصر ادا نہ کی تھی، انہوں نے نماز ادا کی اور کچھ نے کمر سیدھی کرنے لیٹ گئے۔ زمینی مخلوق کو اپنی بشری طبیعت کے تقاضوں سے سے دست و گریباں رہتے ہوئے کئی گھنٹوں بعد فتح کی عندیہ اُس وقت ملا جب انہیں سارے دن کے سفر کے بعد رفعِ حاجت کا پہلا آبرومندانہ موقعہ فراہم آیا۔ لیکن یہاں بھی آسمانی شہر کے قوانین نرالے نظر آئے۔ کیونکہ مسجد کے دروازے پر تو بس ایک ہی واش روم تھا جو سہولت فراہم کرنے کی بجائے ہر مسافر کے احساسِ رفعِ حاجت کو مزید اجاگر کر رہا تھا۔ لیکن یہ سارا منظر اُس وقت بدل گیا جب چند بچے چند مسافروں کو پکڑ پکڑ کے اپنے بنگلوں، کوٹھیوں اور گھروں کے کھلے دروازے دکھانے لگے۔ ہر گھر کے صحن میں سنگ مرمر سے مزین واش روم آرامکدے محسوس ہو رہے تھے۔ اگر عرشیوں کا یہ ایثار نہ ہوتا تو کئی فرشی نا قابل تلافی حوادث کی لپیٹ میں آجاتے۔

البتہ ہم فرشی مخلوق بھی عجیب مخلوق ہیں۔ دراصل، ہماری ساخت و ساز عجیب و غریب اور اس کے تقاضے متضاد ہیں۔ ایک لمحہ قبل جو لوگ رفعِ حاجت کے لیے تڑپ رہے تھے، اب پھر سے ٹینکیاں بھرنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگے۔ لیکن چونکہ آسمانی شہر میں ہر انسانی تقاضے کا بندوبست موجود تھا، لہٰذا فرشیوں کے ان فطری طور پر متصادم میلانات کے درمیان بھی کوئی تصادم نہ ہوا۔ سوپ اور برگر تو میرے ہاتھ میں گویا زبردستی ہی تھما دیے گئے تھے، لیکن سب سے زیادہ ہوس تو مجھے ''شراباً طہوراً'' کی تھی۔ جی ہاں! پریشانی کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کیونکہ شیشے کے جام، چائے کی ''شراباً طہوراً''

سے لبریز نہ تنہا چمک ، بلکہ مئے گساروں کی طرف لپک رہے تھے۔ میرا کیا قصور؟ میں نے بھی ایک نہیں، دو جام چڑھا لیے۔

آئل چینجنگ کے بعد سب نے سکھ کا سانس لیا اور تازہ دَم ہو گئے۔ لیکن منزل مقصود سے ابھی کوسوں دور تھے۔ لہٰذا: ع ''پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے!'' کے مصداق ہم تھے اور روڈ کا کنارہ۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ پرندے آشیانوں میں سر چھپا رہے تھے، لیکن ہم آہنگ پرواز لیے سڑک کے کنارے کسی براق کے میسر آجانے کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ چند ملائیکہ نے ہمیں گھیرے میں لیا ہوا تھا اور بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ : ع

''دن ڈھلا، رات پھر آگئی، سو رہو! سو رہو!''

فقط یہی نہیں، وہ ہمیں کہکشاؤں کے راستے بھی دکھا رہے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ قریب کی منزل آمادہ ہے۔ آپ راضی تو ہوں، ہم ڈراپ کر دیں گے۔ ''مرتا کیا نہ کرتا!'' ہم بھی راضی ہو گئے۔ لیکن جب ملائیکہ نے ہمارا کارواں دو الگ الگ ٹولیوں میں بانٹ لیا اور اپنے اپنے حصے کو مال غنیمت سمجھ کر اپنی مخصوص اماریوں میں بھرنا شروع کیا تو مجھے ایک اماری میں بند شیشوں کے پیچھے جگہ مل گئی۔ میں خوش تو تھا لیکن دل میں یہ احساس بھی کروٹ لے رہا تھا کہ میرے دوست پیچھے کھلی ہوا میں ٹھنڈ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ لیکن اس احساسِ گناہ کو میں اس وقت بھول گیا جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ آسمانی مخلوق بھی جھوٹ بولتی ہے!!

بس فرق فقط اتنا ہے کہ فرشی ''منفعت آمیز'' جھوٹ بولتے ہیں اور یہ عرشی ''مصلحت آمیز'' جھوٹ بول رہے تھے۔ جی ہاں! اخلاقیات کے باب میں ایک معرکۃ الآراء بحث یہی ہے کہ آیا جھوٹ اپنی ذات میں ایک برائی ہے یا جھوٹ کا انگیزہ اُسے برائی یا اچھائی بناتا ہے؟ فلسفۂ اخلاق میں اس بحث کا نتیجہ جو بھی ہو، مجھے اُس سے سروکار نہیں۔ میں تو اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ جن عرشیوں سے ہمارا پالا پڑا، اُن کے اخلاق پر یہی منطق حاکم تھی کہ جھوٹ اگر مصلحت آمیز ہو تو نہ تنہا برائی نہیں، بلکہ عین اچھائی ہے۔ لہٰذا انہوں نے چند گز کے فاصلے پر جس منزل کا نشان پتہ دیا، تیز رفتار اماریوں کی پرواز صاف صاف بتا رہی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر آسمانی مخلوق، اہل زمین سے یوں فراڈ کرنے لگے تو زمینیوں کا کیا حال ہو گا؟ ہمیشہ فرشی مخلوق اپنی چیرہ دستیوں کے ذریعے عرشیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے لیکن آج تو عرشیوں نے وہ ہاتھ دکھائے کہ فرشی انگشت بہ دنداں تھے۔ بلکہ تھوڑی ہی دیر میں معاملہ حیرت کی وادی سے نکل کر خوف کے دہشت میں جا پہنچا۔ اب ہم شہر کی روشنیوں سے باہر نکل چکے تھے۔ ہر طرف اندھیرے ہی اندھیرے تھے اور تاریکیوں کے درمیان سے ویرانوں کی طرف بڑھتا ایک فرعی روڈ۔ سچ پوچھیں تو میں بھی دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ مجھے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ ہم کسی کے چکر میں تو نہیں آ گئے۔ البتہ عرشیوں کا انداز گفتگو، چہروں کی نورانیّت اور مہمان نوازی کا اہتمام، خوف کی ان چنگاریوں پر راکھ بن کر انہیں بجھا رہا تھا۔

بہر صورت، خوف و رجاء کی وہ حالت جو عرفان اور سیر و سلوک کا منتہی ہے، جس کی مجھے کبھی ہوا نہیں لگی، آج یہ حالت مجھ پر از خود ہی طاری ہوتی جا رہی تھی کہ اتنے میں کیبن سے باہر بیٹھے مسافروں میں سے ایک نے شیشہ بجا ہی دیا۔ دراصل، وہ اس عرفانی حالت میں مجھ سے بھی آگے نکل چکے تھے اور اُن پر رجاء کی بجائے خوف کی حالت کچھ زیادہ ہی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے شیشہ اتارا۔ پوچھا: ''بھائی! کیا مسئلہ ہے؟'' کہنے لگے: ''ہمیں کہیں شہید کروانے تو نہیں لے جا رہے؟'' میں نے انہیں تو جھوٹی سچی تسلی دی، لیکن خود ایک طرح کے احساسِ مسوولیت میں ڈوبنے لگا۔ تاہم جن کا سہارا خدا ہو وہ ڈوبتے نہیں۔ لہٰذا اس سفر کے نقطۂ آغاز سے محض ۱۷ کلومیٹر کے فاصلے پر جا کر یہ ساری تشویش ختم ہوئی۔ ہم ایک ایسی عمارت کے سامنے رکے جسے میں مہمان خانہ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس عمارت کا کوئی نام تجویز کروں، اس حصے کی آخری بات پہلے سن لیں!

وہ یہ کہ ہماری اماری ''ولدانٌ مخلدّون'' کا دَم خم رکھتے ''ہر دَم، تازہ دَم'' نوجوانوں کی آغوش میں رکی۔ اِن لڑکوں نے تو اپنے انوکھے سلیقے سے خدمتگزاری کے سب سلیقے پیچھے چھوڑ دیے۔ گویا ہمارا سامانِ سفر ہم سے چھین کر ایک خاص ترتیب سے ٹھکانے لگا دیا اور بڑوں کے اشاروں پر ہماری خدمت میں مصروف ہو گئے۔ کوئی وضو خانہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے تو کوئی تولیہ صابن کا بندوبست کر رہا ہے۔ کوئی مصلیٰ بچھا رہا ہے تو کوئی صفیں سیدھی کر رہا ہے۔۔۔

آسمانی شہر یا مدینۂ فاضلہ؟

اگرچہ میری سپیشلائزیشن اسلامی فلسفہ میں ہے تاہم آشنائی کی حد تک چند یونانی اور یورپی فلاسفرز کے نظریات بھی سن، پڑھ رکھے ہیں۔ قدیم یونان میں انسانی سماج یا ''جمہور'' کے بارے میں ارسطو اور افلاطون کے نظریات کا اجمالی تعارف، نیز اسلامی فلسفہ میں فارابی کے ''مدینۂ فاضلہ'' کا ایک اجمالی تصوّر میرے ذہن میں طالبعلمی کے زمانہ سے موجود ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یورپی ادبیات میں ''مدینۂ فاضلہ'' کے مترادف یا متشابہ ''آٹوپیا'' (Utopia) کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ بہر صورت، ارسطو و افلاطون کا ''مدینۂ فاضلہ'' ہو یا فارابی کا ''مدینۂ فاضلہ'' یا تھامس مور کا ''آٹوپیا'' اِن سب کا مرکزی خیال ایک ایسے خیالی، لیکن مثالی شہر یا انسانی سماج کا ہے جس میں انسان اپنے سماجی سفر کی آخری ممکنہ تکاملی منزل پر پہنچ جائے گا۔

البتہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تصور اتنا خیالی ہے کہ اس کے تحقق کا کوئی امکان ہی نہیں۔ لہٰذا فلسفی ادبیات میں بعض دانشوروں نے ''آٹوپیا'' کو ''ناکجاآباد''، ''لامکان'' یا عام الفاظ میں ''دیومالائی'' شہر قرار دیا ہے۔ یعنی ایک ایسا سماج جو اس دھرتی پر تحقق نہیں پا سکتا۔ البتہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ کیونکہ مغرب کا ''آٹوپیا'' ہو یا ارسطو و افلاطون یا فارابی کا ''مدینۂ فاضلہ'' قطعاً ان کے تحقق کے امکان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ انسانی سماج اپنے تکاملی سفر میں اس نہائی منزل تک پہنچ جائے۔

خلاصہ یہ کہ مدینۂ فاضلہ کا قیام اس کرۂ خاکی کے تمام فاضل افراد کی ہمیشہ سے گم گشتہ متاع رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ فضلاء اپنے تمام تر عقلی تأملات کے باوجود ایسا شہر تأسیس نہیں کر پائے اور نہ ہی قریب قریب انہیں اس کے قیام کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ لیکن جس شہر آسمانی شہر کی سیاحت کا سفر نامہ میں لکھ رہا ہوں، وہ نہ تنہا ''مدینۂ فاضلہ'' کی تمام خصوصیات سے مزین تھا، بلکہ اس میں ایسی امتیازی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں جن کا تصوّر ہمیں مدینۂ فاضلہ یا آٹوپیا کے ڈھانچے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ دوسرے الفاظ میں میرا دعوی یہ ہے کہ میں نے اس سیاحت میں مدینۂ فاضلہ سے بہتر انسانی سماج کشف کیا ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا نام ''مدینۂ فاضلہ'' کی بجائے ''آسمانی شہر'' تجویز کیا ہے۔

کیونکہ ارسطو و افلاطون اور فارابی کے مدینۂ فاضلہ کی تمام بنیادی خوبیاں عدالت، حکمت، شجاعت اور خودداری میں منحصر نظر آتی ہیں۔ فارابی کے مطابق مدینۂ فاضلہ ایک ایسا سماج ہے جو اقوام کے جغرافیائی امتیازات اور سرحدوں سے بالاتر ہے اور انسانی سعادت یا ''خیرِ برتر'' اس سماج کی نشانی ہے۔ حکیم (فلسفی) اس شہر کا سلطان یا بادشاہ ہے۔ فلاسفرز کے مدینۂ فاضلہ میں قانون، قانون کا اجراء کرنے والے ادارے، پولیس یا فوج کا وجود اس لیے کمتر نظر آتا کیونکہ اس شہر کا ہر انسان اپنے اندر سے قانون مند ہے اور خود اپنے لیے پولیس مین ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس سماج میں یہ خصوصیات پائی جائیں وہ فلاسفرز کا ''مدینۂ فاضلہ'' نام پاتا ہے۔ جہاں تک ہمارے آسمانی شہر کا تعلق ہے تو اُس میں نہ تنہا یہ سب خوبیاں، بلکہ اضافی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا ترقی یافتہ سماج ہے جس میں وطن کا تصّور اتنا وسیع ہے جتنی اللہ تعالی کی زمین وسیع ہے۔ بقول علامہ اقبال

صحرا است کہ دریاست، تہ بال و پر ماست

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

یعنی: ''صحرا ہو یا دریا، سب ہمارے پروں تلے ہیں۔ ہر ملک
ہمارا ملک ہے، کیونکہ ہر ملک ہمارے خدا کا ملک ہے۔''

لہٰذا آسمانی شہر میں داخلے کے وقت مختلف ممالک کے درمیان انٹرنیشنل باؤنڈریز اور ایمیگریشن کے قوانین میں سے کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا تھا۔ یہ قصّہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ مزید وضاحت میں اتنا سن لیجئے کہ اس شہر میں کسی قسم کی کوئی نسلی، لسانی، قومی اور جغرافیائی سرحدیں وجود نہیں رکھتیں۔ میں نے اس شہر کے سب باشندے کو بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ایک ہی ملت میں گم پایا۔ نہ تورانی باقی تھا، نہ ایرانی اور نہ ہی افغانی۔ باقی رہے پاکستانی یا ہندوستانی، تو جب حکیم الامت نے اپنے اشعار میں ان کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا تو میری کیا مجال کہ اُن کا ذکرِ خیر کروں؟ کیوں نہ مثبت تاویل کی جائے اور وہ یہ کہ پاکستانی اور ہندوستانی اور دیگر مسلم اقوام کے باشندے، تورانیوں، ایرانیوں اور افغانیوں سے کمتر نسلی، لسانی اور جغرافیائی امتیازات کے قائل ہیں اور وہ جلد ان امتیازات کو بھول کر ایک ہی ملت میں گم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ایسی دعوت دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

معاف کرنا! یہ تو سبقتِ لسانی کے سبب بات سے بات آگے نکل گئی۔ میں اصل بات تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر فارابی کا مدینۂ فاضلہ اقوام کے جغرافیائی امتیازات اور سرحدوں سے بالاتر ہے اور انسانی سعادت یا ''خیرِ برتر'' اس سماج کی علامت ہے تو ہمارے آسمانی شہر میں بھی یہ سب خدّوخال نمایاں تھے۔ بلکہ اِس سماج کی نشانی، ''فوز و فلاح'' ہے جو مدینۂ فاضلہ کے تصوّر میں اس خصوصیت کے ساتھ نہ مل سکے گی۔ اور اگر ہم مدینۂ فاضلہ کے اساسی تصوّر یعنی ''عدالت'' کو لے لیں تو آسمانی شہر میں عدالت تو پائی ہی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ یہاں عدالت سے بڑھ کر ایثار اور عفو و درگذر کی ناقابل فراموش داستانیں رقم کی جاتی ہیں۔

آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ آیا یہ عدالت کے منافی تھا کہ جن ڈرائیورز نے اپنے ٹریلرز میں بٹھا کر ہمیں لگ بھگ ساٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کروایا، وہ ہم سے مناسب کرایہ وصول کر لیتے؟ یقیناً یہ عینِ عدالت تھا۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہمارے کرۂ خاکی پر جس قدر ناانصافی ٹرانسپورٹرز کرتے ہیں، شاید ہی کوئی دوسرا طبقہ کرتا ہو۔ ہو سکتا ہے میرا یہ بیان مبالغہ آمیز ہو، تاہم اجنبی شہروں اور ملکوں کا سفر کرنے والے اجنبی مسافر خوب جانتے ہیں کہ ٹریول ایجنسیوں سے لے کر ٹیکسی ڈرائیورز تک، پورے ٹرانسپورٹنگ سسٹم میں بیچارے مسافروں کو کتنا لوٹا جاتا ہے۔ اب اس کے برعکس، اگر کسی شہر کا ٹرانسپورٹنگ سسٹم اس حد تک انسانی اور اخلاقی بن جائے کہ اُس کا ایک ٹریلر ڈرائیور بھی نہ تنہا اپنا جائز کرایہ وصول نہ کرے بلکہ لفٹ دینے پر مسافر کا شکریہ بھی ادا کر رہا ہو اور یوں ایثار کی معراج کو چھو لے تو آیا اس سماج کو ''مدینۂ فاضلہ'' کا نام دینا بہتر ہے یا ''آسمانی شہر'' کہنا مناسب تر؟

اب ذرا ہوٹلنگ کے نقطۂ نظر سے بھی آسمانی شہر کا ماحول ملاحظہ فرمائیے! ہمارا مشاہدہ تو یہی بتاتا ہے کہ صدیوں سے فکر و فلسفہ اور اخلاق و سیاست کے ناخدا ہمارے کرۂ خاکی کے باشندوں کو اتنا ایثار نہیں سکھا سکے کہ اگر چند اجنبی کسی ہوٹل میں اکٹھے ہو جائیں تو ہوٹل مالک ان سے رہائش کا کرایہ نہ لے یا ایک مسافر دوسرے اجنبی مسافر کا کھانے کا بل ادا کر دے۔ ''آٹوپیا'' کے معماروں کا سماج تو آج یہاں کھڑا ہے کہ اگر باپ بیٹا کسی ہوٹل پر اکٹھے ہو جائیں تو دونوں الگ الگ اپنا اپنا بل ادا کرتے ہیں۔ اب اگر ایسے میں انسانی سماج کا کوئی معمار اُسے مدنی تکامل کی اس منزل پر پہنچا دے کہ اقامت فراہم کرنے والے اربوں مسافروں کو مفت میں رہائش فراہم کر دیں اور لاکھوں ڈالرز کا کھانا مفت میں کھلا دیں تو آیا ایسے معمار کو جھک کر سلام نہیں کرنا چاہیے؟ آیا اس سماج کو محض مدینۂ فاضلہ قرار دے دینا ناانصافی نہیں ہوگا؟

ایک اور زاویے سے یہی انفاق کتنی بڑی شجاعت ہے؟ اِس کا اندازہ مال و دولت کے پوجاریوں سے لگوایئے! بات تنہا اس انفاق پر نہیں رکتی بلکہ اس انفاق پر آسمانی شہر کے لوگ کتنی مسرت محسوس کرتے ہیں؟ اس کا معمولی سا ادراک اس تگ و دو سے کیا جا سکتا ہے کہ میزبان سترہ کلومیٹر تک کا فاصلہ طے کر کے سڑک کے کنارے سارا دن مسافروں کا منہ تکتے ہیں اور ساتھ ساتھ خدا سے یہ دعا مانگتے ہیں کہ آج کی رات کے لیے چند مہمان ہمارے رزق میں عطا فرما دے!

آیا تاریخ بشریت میں کوئی فلسفی ایسا سماج قائم کر سکا؟ آیا کسی سیاسی نظام نے ایسا مدینۂ فاضلہ دیا؟ آیا کوئی حکیم ایسی سلطنت قائم کر پایا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک حکیم اس نوع کی ضیافت کی شرافت کا عقل سوز فلسفی تأملات کے بعد ادراک کر لے۔ لیکن کیا حکمت عشق کے ان مظاہر کی تفسیر پیش کر سکتی ہے؟ ہر گز نہیں! جب ایسا ہے تو کیا عشق کی سلطنت کو حکمت کے شہر کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہر گز نہیں! یقیناً سلطانِ حکمت جب تک کمر خمیدہ، لباس دریدہ، تھکا ہارا، بیمار اور بوڑھا نہ ہو جائے، سلطانِ عشق کی سرحدوں میں داخلے کی اجازت اُسے نہیں مل سکتی۔

مذکورہ داستان کے مطابق جب آسمانی شہر کو مدینۂ فاضلہ پر ہر لحاظ سے برتری حاصل ہے تو کیا میں انسانی سماج کے تعمیر کاروں کو یہ دعوت نہیں دے سکتا کہ: "اے کرۂ خاکی کے سادہ لوح باشندو! آٹوپیا یا مدینۂ فاضلہ کے خیالی تصورات سے دل نہ بہلاؤ۔ کیونکہ نہ فکر و فلسفہ کے افاضل کے خالص عقلی تأملات کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر یہ شہر آباد کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی فلسفۂ اخلاق کے دانشوروں کے رشحاتِ قلم سے بنی ناؤ پر سوار ہو کر ناکجا آباد پہنچا جا سکتا ہے۔ میدانِ سیاست کے مکاروں اور چالبازیوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی یہ حقیقت تعمیر نہیں کی جا سکتی ہے۔ ملکوت ندیدہ، عالمِ مُلک کے آبادکاروں کا مدینۂ فاضلہ یا "آٹوپیا" ہمیشہ "ناکجاآباد" رہے گا اور یہ معاشرہ ہمارے کرۂ خاکی پر کبھی تحقق نہ پا سکے گا۔ لہٰذا آؤ میرے ساتھ چلو! عالمِ ملکوت کی سیر کرتے ہیں اور آسمانی شہر کی سیاحت کا سفر نامہ جاری رکھتے ہیں!"

مہمان خانہ یا عزاخانہ؟

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ آسمانی شہر کے سفر میں ہم جس عمارت کے سامنے رکے، میں اُسے مہمان خانے کا نام نہیں دے سکتا۔ تو کیا نام دوں؟ دراصل، یہ نام پہلے سے دیا جا چکا ہے۔ کیا؟ "عزاخانہ"۔ یعنی، وہ

عمارت جس میں فخر الرسل حضرت ختمی مرتبت ﷺ کے نواسۂ گرامی اور نورِ عین حضرت امام حسین علیہ السلام کی دردناک شہادت پر مجلسِ عزا بپا ہوتی ہے اور گریہ و ماتم کیا جاتا ہے۔آپ پوچھیں گے: کیا آسمانی شہروں میں بھی عزا خانے ہوتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ: کیوں نہ ہوں! جبکہ پیغمبر اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ حسینؑ زمین اور آسمانوں کی زینت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں حسینؑ پر فرشی مخلوات گریہ کرتی ہیں، عرشی بھی اس عبادت میں پیچھے نہیں رہتے اور وہ بھی امام حسین علیہ السلام کی زیارت کو آتے ہیں اور آپؑ کی مظلومانہ شہادت پر گریہ و ماتم کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ دن بھر عرشیوں کے ہمراہ سفر کرتے کرتے ہم نے بھی عرشی تہذیب کے چند آداب سیکھ لیے تھے۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ اس سے قبل کہ ہمارے سامنے کوئی آسمانی مائدہ لگایا جائے، عرشیوں کا کچھ قرض اتار دیا جائے۔ لہٰذا تھکے ماندوں نے نماز مغربین کی نماز باجماعت ادا کی اور نماز کی صفوں پر ہی صف عزا بچھا دی۔ سامنے نظر آنے والوں کے علاوہ نواسۂ رسول پر رونے اور کون کون حاضر ہوا؟ اس سوال کا جواب، میں نہیں دے سکتا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو اُس کا سارا ثواب ہم نے اٹھا کر اپنے میزبانوں اور اُن کے مرحومین کو ادا کرنا چاہا کہ احسان کا کچھ بدلہ تو اتر جائے۔ لیکن مجلسِ عزا کا ثواب اتنا زیادہ تھا کہ نہ تنہا میزبانوں اور اُن کے مرحومین میں بٹا، بلکہ تمام مؤمنین اور خود ہمارے مرحومین نے بھی اِس سے اپنی اپنی جھولیاں بھریں۔

آسمانی شہر یا سلطنتِ عشق؟

میرے سفر نامہ میں اب تک جس سماج کا نام "آسمانی شہر" رہا، اب مجھے اُس کی نامگذاری پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ یہاں سے بعد کے واقعات ایسے ہیں جن کی توضیح و تفسیر یا Justification نہ تو میں فلاسفرز کے عقلی تأملات کی بنیاد پر کر سکتا ہوں اور نہ ہی کسی دیگر مادی و معنوی معیار پر۔ اگر میں افلاطون و فارابی کے مدینۂ فاضلہ کی سیسہ پلائی اساس یعنی "حکمت" کو بھی بنیاد بنا کر اِن واقعات کی توضیح پیش کرنا چاہوں، پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان واقعات میں مجھے تو افلاطون و فارابی کی "حکمت"، آتش نمرود کے دہانے کھڑی "عقل" کا وہی مضطرب منظر پیش کرتی نظر آتی ہے جس کی تصویر کشی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کر دی ہے:

بے خطر کود پڑا، آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

لہٰذا اب ہم انسانی سماج کی جن حسین اور دلکش وادیوں میں داخل ہو رہے ہیں، اُن کی بادشاہت کا حق فارابی کے مجسمۂ فضائل "حکیم" کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ فارابی کا حکیم، مملکتِ عقل کا بادشاہ تو بن سکتا ہے، سلطنتِ عشق کا سلطان نہیں بن سکتا۔

کیونکہ سلطنتِ عشق کا بے تاج تو کیا بے سر بادشاہ وہ ہے جس کے ہاتھ میں جامِ جم نہیں بلکہ ہاتھ جامِ جَم سے زیادہ شفاف ہیں۔ اتنی شفافیت کہ وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں، اپنی سلطنت کے ہر نقطہ پر موجود اپنی رعایا کا ہر اچھا بُرا کام مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف اُس کی رعایا کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں، اپنے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطنتِ عشق میں آپ کو سرے سے کوئی پولیس والا نظر نہیں آئے گا۔ اس سلطنت کا کوئی مدنی قانون بھی نہیں ہے۔ یہاں قانون بنانے والے ادارے اور قانون دان بھی نظر نہیں آتے۔ ہاں! اس ساری مملکت پر تنہا ایک ہی قانون حکرانی کرتا ہے اور وہ یہ کہ: "کہیں میرا محبوب مجھ سے ناراض نہ ہو جائے!"

باقی ماندہ سفر نامہ؟

آپ سُن چکے کہ اب ہم آسمانی شہر سے سلطنتِ عشق میں داخل ہو چکے ہیں۔ چونکہ اِس تحریر کا عنوان "ایک آسمانی شہر کی سیاحت" تھا، لہٰذا اس سفر نامہ سفر نامہ کو آگے بڑھانے سے جہاں اس کے "عنوان" کے ساتھ ناانصافی ہو گی، وہاں اِس جلد بازی میں اس کے "بیان" کے ساتھ بھی ناانصافی ہو گی۔ اگر آپ کہیں کہ جلد بازی کس بات کی؟ تو اپنی زبان سے نہیں، بلکہ مجلّہ "نورِ معرفت" کے انتہائی مخلص، جانسوز اور پُر دَرد مدیر کی زبان سے یہی عذر پیش کروں گا کہ: "ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی ہمارا مجلّہ تاخیر سے قارئین کی خدمت میں پہنچ رہا ہے، جس کا عمدہ سبب ہمارے لکھاریوں کی طرف سے تاخیر سے تحریریں وصول ہونا ہے۔" لہٰذا اِس امید پر آپ سے رخصت ہوتا ہوں کہ آپ دعا فرمائیں گے اور میں اپنے سفر نامے کو آگے بڑھا پاؤں گا۔ ہاں! اِس آسمانی شہر کی سیاحت کے خواہشمندوں کے لیے اس کا پتہ یہ ہے کہ ہو سکے تو نواسۂ رسول ﷺ حضرت امام حسینؑ کا چہلم منانے عراق کے کسی بارڈر سے نجف اور وہاں سے کربلا کا رُخ کر لینا۔ اور اگر اس سفر میں آپ نے سفر کی ہر روئیداد کو تجزیہ و تحلیل کے اُس زاویے سے دیکھا، جس سے میں نے دیکھا ہے، تو سفر کی داستان کے بیان میں یقیناً آپ میرے ساتھ مکمل اتفاق فرمائیں گے!

DISJOINTED LETTERS: AN ANALYTICAL STUDY OF DIFFERENT VIEWS (2)

By: ***Saqib Akbar***
ukhuwat@gmail.com

Key Words: *Reason and secret, the names of Allah, pondering on Quran, infidels*

Abstract:

Disjointed letters in Quran are extraordinary. Such letters did not exist in previous divine books. Interestingly, even those people who were used to denigrate every word of the prophet (PBUH) did not do so regarding the disjointed letters. The disparagement of some Jewish scholars is an exception in this regard. In the first part of this article, seven views of different scholars had been discussed. In this part, some more points are being presented. Firstly; the disjointed letters are a secret between Allah almighty and the holy prophet. Secondly; these letters are the names of Allah. Thirdly; these letters have continuously been captivating the thinking of human beings. One of the reasons behind the revelation of these letters may be to set an avenue of pondering in Quran for the readers of the Quran so that they may learn to think deeply. Fourthly; these letters stand for meanings and things. This view has been developed by maolana Hamid al Din Farahi, later on his disciples, as a possible explanation of these letters. Fifthly, these letters, at the beginning of some chapters, were to make infidels silent as they were used to forbid each other from listening Quran as well as to make a noise when Quran was being recited. Allah, therefore, descended these letters in some chapters so that they could be silent after listening them. When they listened these letters, they seem them to be strange and they started to listen and thin.

KINDNESS AND STRICTNESS OF THE HOLY PROPHET IN THE LIGHT OF QURAN

By: ***Syed Aqeel Haider Zaidi***
aqeel.zaidi1968@gmail.com

Key Words*: Kindness, the ideal example, social ethics.*

Abstract:

In this article, an attempt has been made to present the kindness (rahmah) and strictness (shiddah) of the holy prophet in the light of the holy Quran. The purpose of this article is to present different positive/noble as well as negative/inappropriate patterns of action so that a direction could be given to the journey of humanity. We can conclude, in the light of Quran, that Islam has given divine as well as human ideals in accordance with the spiritual needs of humanity. Islam as presented prophets, especially hazrat Ibrahim (Abraham) and Hazrat Muhammad (peace be upon them), as ideals examples for human character. Quran introduces the holy prophet as kind and strict, generally and specifically. And these two characteristics of the holy prophet, in the view of Quran, are among the most important aspects of the prophet's collective and social ethics.

THE INCIDENT OF KARBALA AND THE POLITICO-RELIGIOUS TENDENCIES OF KUFANS

By: ***Syed Rameez al Hassan Mosavi***
srhm2000@yahoo.com

Key Words: *Imam Hussain (a.s), Kufans (the people of Kufa), Muslim bin Aqeel, Amir of Syria, Umayyad preachers, Ibn-e-Ziyad,the city of Kufa, Shiites of Kufa.*

Abstract:

The role of Kofans is of great significance in the incident of Karbala. Any analyst who has worked on the tragic event of Karbala has presented the role of the Kufans. Yet, Immoderation and exaggeration could be seen in this regard. It is doubtless that Kofan invited Imam Hussain (a.s) to Kufa, but it is questionable that whether those were Shias who fought against the Imam. To analyze this historical fallacy we have to study the politico-religious tendencies of the Muslims of the Kufa of 61 hijra. It is indispensable to look at the dynamics of that era. What was the meaning and usage of the word "Shia"; what the Umayyad did to dominate Kufa and to extinguish the influence of the Ahl al Bait; how many people were Shia by-belief and how many people were mere political supporters, having hatred for the Umayyad dynasty, amongst those who wrote letters to the Imam; how many people considered it a divine obligation to follow the Ahl al Bait and what was their politico-collective psyche? are some of the questions that have been discussed in this article. Without considering such issue properly, it could be a historical fallacy to say that the majority of the Umar Ibn-e-Saad's army belonged to Shia Muslims. This misperception has been propagated by the Umayyad preachers to keep general Muslim populace away from the mourning of the Imam as well as to hide the role of Umayyad in the martyrdom of imam and the desecration of the holy family of the Prophet (PBUH).

THE LOYALTY OF THE COMPANIONS OF IMAM HUSSAIN (A.S)

*By:**Dr. Abbas Haider Zaidi***
abbaspsc@yahoo.com

***Key Words**: Pledge of allegiance, companions of imam Hussain, Ibn-e-Ziyad, Umar ib-e-Saad, the army of Umar Saad.*

Abstract:

The devoted companions of imam Hussain have marked history with their martyrdom. Those were the people who fulfilled their promise of helping imam by embracing martyrdom and left the greatest standard of loyalty behind themselves. Yazid dispatched a letter to the governor of Medina in which he ordered him to take the oath of allegiance on his behalf from imam Hussain and some other people and behead them on their refusal. With the exception of few persons, the whole populace of Hejaz, Yemen, Syria, and Kufa had pledged their allegiance to Yazid till that time. Imam Hussain refused to pledge his allegiance to Yazid and left Medina for Mecca with his family and companions. When imam found Mecca unsuitable for his presence, he left Mecca for Kufa on 8th of Zul Hajjah. The companions of imam Hussain expressed their feelings and loyalty to imam on many occasions. Once, after hearing their conversation, imam assured hazrat Zainab (s.a) of their loyalty. At that time, they drew theirs swords out of covers and pledged to keep the swords till the last moment. We cannot put the passion, thrill, and loyalty of the Imam's companions in words. They preferred to be beheaded instead of bow their heads. The words of imam Hussain are written in history he spelled out on the martyrdom of his companions. The passion of the companions of imam Hussain as well as the words of the imam regarding his companions have been presented in this article.

A HISTORICAL OVERVIEW OF THE RIVALRY BETWEEN HASHEMITE AND UMAYYAD: FROM THE ERA OF DIVINE IGNORANCE TO THE PERIOD OF THE PROPHETHOOD

By: ***Dr. Syed Abbas Haider Wasti***
dr.shah_wasti@gmail.com

Key Words*: The era of divine ignorance, Hashemite (bano hashim), Umayyad (bano ummiyah), Qosai bin kilaab, abd-e-manaaf bin kilaab, abd-e-manaaf bin qosai, banu odai, banu tameem.*

Abstract:

Even after the passing of centuries, the cruelty of Umayyad to Hashemite is still in the pages of history. Here, a question arises that what kind of rivalry existed between Hashemite and Umayyad that resulted in the occurrence of many bitter events. In this article, an analytical overview of the rivalry between Hashemite and Umayyad, from the era of divine ignorance to the period of the prophethood has be given to answer the above mentioned question. Qosai was among the one of the ancestors of the holy prophet. Qosai married the daughter of Halil bin Habshia, the guardian of holy Kaba, after the death of Halil, all tribes of mecca extended the guardianship of the holy Kaba to Qosai on the basis of his talent and potentialities. Qosai had four sons among them two got fame i.e. Abd-e-Manaaf and Abd al Aza'a. After the death of qosai, his son abd-e-manaaf ruled the quraish. Abd-e-Manaaf got six sons. The elder son of abd-e-manaaf was muttalib. Second was amr who is well known as hashim. Third was abd al shams who was twin brother of the former. One of the fingers of Abd al Shams was stick on the forehead of Hashim that was separated later by a knife, on their birth. It was predicted on that time that there would be bloodshed between the descendants of both brothers. The concern of this article is the rivalry between the descendants of Hashim and Abd al Shams. Umayyad had always been hostile to Hashemite. During the days of the holy prophet, the Umayyad remained tactically silent and historians thought it was the end of Umayyad's hostility with Hashemite. In fact, the Umayyad were looking for an appropriate time to manifest their deep-rooted animosity towards Hashemite. After the demise of the holy prophet, the Umayyad once again become active in their antagonism towards Hashemite and finally succeeded in their mission cunning tactics. The story of their barbarism is written in the pages of history with the blood and tears of Hashemite.

THE PROHIBITION OF EXCOMMUNICATING THE PEOPLE OF QIBLAH IN THE LIGHT OF QURAN AND SUNNAH

By: ***Syed Muzammil Hussain Naqvi***

Key Words*: Unity and solidarity, people of Qibla (Muslims), Imam Jafar Sadiq (a.s), Imam Shafi'I, Imam Abu Hanifah, Ibn-e-Taimia.*

Abstract:

Islam has termed strong mutual bounds and collective life a great blessing. According to the holy Quran, unity is a blessing and disunity and division are a punishment/curse. It was the mutual division that caused the fall of Baghdad, a tragic event of the Islamic history, that become a great lose for Muslims. Sectarianism has pushed Muslims back to decades. According to the holy Quran, the believers are brethren. The holy prophet has said "o the slaves of Allah! Be brothers to one another. A Muslim is the brother of a Muslim. He should neither oppress him nor humiliate him. Likewise, Imam Sadiq has said; "a Muslim is the brother of a Muslim. He is his eye and guide. He do not cheat him; he do not oppress him; he do not tell a lie to him; he do not backbite him". Unity and solidarity in an Islamic society only can be prevailed when we prefer spirituality over materialism and promotion of religion over getting worldly things. Who is a believer? What is the criterion of being Muslim according to Quran and the tradition? Everyone who satisfies that criterion is Muslim. To declare someone apostate on the basis of some act is wrong. In this article, those criteria have been mentioned on the basis of which someone can be a Muslim. It is wrong to excommunicate a Muslim as Imam Abu Hanifah and Imam Shafi'I had said.

THE PHILOSOPHY OF ISLAMIC COMMANDMENTS IN THE LIGHT OF NAHJ AL BALAGHAH

By: ***Roshan Ali***
roshanali007@yahoo.com

Key Words*: The prophets, Islamic commandments, faith, branches of the religion, sila rehmi, Islamic penalties.*

Abstract:

Allah almighty has descended and revealed divine commandments and religious codes through prophets in order to keep human beings safe from distraction and make them obedient to Him. Allah ordained Hazrat Muhammad as His last messenger and provided him with a book and a religion that are the source of guidance for entire humanity. The holy prophet left behind him to precious things i.e. Quran and his members of family for the guidance and progress of humanity. Imam Ali (a.s) is one of the member of his holy family. The collection of the Imam's words and sayings are in our hands in the form of a book- Nahjul Balaghah. The book contains all the principles of living life. In this book, Imam has mentioned the underlying logic and philosophy of some Islamic commandments. While describing the philosophy of Islamic commandments imam has given precise and comprehensive accounts. In this article, those descriptions have been presented. In Nahjul Balaghah, imam has given the philosophy of the branches of the religion (foroa'at-e-deen) and faith. This has been followed by the presentation of Sila Rehmi (loving and treating one's relatives nicely)-like crucial social issues. He has, then, described the philosophy and science of Islamic penalties, Qisas (the right of murder victim's nearest relative-wali- to take the life of the killer in retaliation), and some forbidden acts. In this article, the philosophy of twenty Islamic commandments have been written briefly in the light of Quran and the tradition. Every sentence regarding faith, obedience and namaz to nahi anil munkar (forbidding from sin and evil) is filled with abundance of knowledge and prudence. Issues ranging beliefs to good/noble deeds and politics to society have been beautifully presented in Nahjul Balaghah.

THE UNDERSTANDING OF HOLY IMAMS OF DIFFERENT LANGUAGES

By: Syed Hussnain Abbas Gardezi
hasnain.gardezi@gmail.com

Key Words: *Elm-e-Ladonni (God-given knowledge), heritance of the Prophet (PBUH), elhama'at-e-elahiyyah, Sami nations, siryani language*

Abstract:
The debate about the knowledge of imam is a branch or sub-field of the belief of imamah. According to the belief of imamah, one of the characteristic of an imam is his having vast knowledge and being the holder of elm-e-ladonni. The major argument of imam's having elm-e-ladonni is his being guardian and interpreter of religion. If imam is not aware of all sciences of the religion, he could not perform his duty of guarding, describing, and interpreting religion. For Shiite scholastics and theologian (mutakallimeen) the two sources of the knowledge of imam are Quran and the sciences of prophethood. Imam is heir to all knowledge of imam as he is his successor. The third source of imam's knowledge of imam is elhama'at-e-elahiyyah (a thought that is placed in the heart of anyone directly but Allah without any pondering or deduction) that are delivered to imam by angles or rooh al quds. It is worth-mentioning that there is a difference between Wahe (revelation) and elha'am. Wahe is confined to prophets and except prophets no one can receive wahe. Imam is not prophet, rather his successor.

According to the narrations of ahl al bait, imams were mohaddas i.e. they had heard the conversation of angles and inferred the commandments of Allah from that. The vast knowledge of imam suggests that imam must be able to communicate all people of the world and to guide them. In this article the same issue has been discussed.

According to narrations, imams have had the understanding of some language and had talked in following languages; nibti, siryani, Hindi, Sindhi, ziti, Greek, roman, Hebrew, African, Turkish, and saqlabi.

THE TOUR OF A HEAVENLY CITY

By: Dr. Sheikh Muhammad Hasnain
Sheikh.hasnain26060@gmail.com

Key Words: *Heanenly city, Utopia, Tourism, Wisdom, Justice, Sacrifice, Love, Imam Hussain.*

Abstract:

In this article, the writer has narrated the story of his tour to a Heavenly city. In fact, he has tried to discover the real existence of the concept of ancient and contemporary philosopher's concept of utopia (Madeena-e-Fazlah). According to him, the existence of a transcendent human society (utopia) is not only possible, but also exists. So he calims that he has discovered a sample of this heavenly city on our leaving planet (Earth).

In this story, that is closer to reality than myth, where the writer narrates the superior examples of the social life at heavenly city, he compares it with the concept of Madeena-e-Fazlah (utopia) and declaires his concept of hevenly city much moor superior than the cocept of Madeena-e-Fazlah.

At the end he invites contemporary philosophers and experts in politics and ethics to gain the citizenship of this extra ordinary transcendent human society and to expond the bounderies of this "kingdom of love". He also gives the address to tour this City by participating in the ceremony of the 40th day of the Martyre of Hazrat Imam Hussain (A.S).

ہمسایوں کے ساتھ معاشرت کے آداب

اللّٰھُمّ صَلّ عَلَی مُحَمّدٍ وَ آلِہِ، وَ تَوَلّنِی فِی جِیرَانِی وَ مَوَالِیَّ الْعَارِفِینَ بِحَقّنَا، وَ الْمُنَابِذِینَ لِأَعْدَائِنَا بِأَفْضَلِ وَلَایَتِكَ. وَ وَفّقْھُمْ لِإِقَامَةِ سُنّتِكَ، وَ الْأَخْذِ بِمَحَاسِنِ أَدَبِكَ فِی إِرْفَاقِ ضَعِیفِھِمْ، وَ سَدّ خَلّتِھِمْ، وَ عِیَادَةِ مَرِیضِھِمْ، وَ ھِدَایَةِ مُسْتَرْشِدِھِمْ، وَ مُنَاصَحَةِ مُسْتَشِیرِھِمْ، وَ تَعَھّدِ قَادِمِھِمْ، وَ کِتْمَانِ أَسْرَارِھِمْ، وَ سَتْرِ عَوْرَاتِھِمْ، وَ نُصْرَةِ مَظْلُومِھِمْ، وَ حُسْنِ مُوَاسَاتِھِمْ بِالْمَاعُونِ، وَ الْعَوْدِ عَلَیْھِمْ بِالْجِدَةِ وَ الْإِفْضَالِ، وَ إِعْطَاءِ مَا یَجِبُ لَھُمْ قَبْلَ السّؤَالِ وَ اجْعَلْنِی اللّٰھُمّ أَجْزِی بِالْإِحْسَانِ مُسِیئَھُمْ، وَ أُعْرِضُ بِالتّجَاوُزِ عَنْ ظَالِمِھِمْ، وَ أَسْتَعْمِلُ حُسْنَ الظّنّ فِی کَافّتِھِمْ، وَ أَتَوَلّی بِالْبِرّ عَامّتَھُمْ، وَ أَغُضّ بَصَرِی عَنْھُمْ عِفّةً، وَ أُلِینُ جَانِبِی لَھُمْ تَوَاضُعاً، وَ أَرِقّ عَلَی أَھْلِ الْبَلَاءِ مِنْھُمْ رَحْمَةً، وَ أُسِرّ لَھُمْ بِالْغَیْبِ مَوَدّةً، وَ أُحِبّ بَقَاءَ النّعْمَةِ عِنْدَھُمْ نُصْحاً، وَ أُوجِبُ لَھُمْ مَا أُوجِبُ لِخَاصّتِی، وَ أَرْعَی لَھُمْ مَا أَرْعَی لِخَاصّتِی.

یعنی: ''اے اللہ! محمد اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما۔ اور میری اس سلسلہ میں بہترین نصرت فرما کہ میں اپنے ہمسایوں اور ان دوستوں کے حقوق کا لحاظ رکھوں جو ہمارے حق کے پہچاننے والے اور ہمارے دشمنوں کے مخالف ہیں اور انہیں ایسے طریقوں پر قائم رہنے اور عمدہ اخلاق وآداب سے آراستہ ہونے کی توفیق دے اس طرح کہ وہ کمزوروں کے ساتھ نرم رویہ رکھیں اور ان کے فقر کا مداوا کریں۔ مریضوں کی بیمار پرسی، طالبان ہدایت کی ہدایت، مشورہ کرنے والوں کی خیر خواہی اور تازہ وارد کی ملاقات کریں۔ رازوں کو چھپائیں، عیبوں پر پردہ ڈالیں۔ مظلوم کی نصرت اور گھریلو ضروریات کے ذریعہ حسن مواسات کریں اور بخشش وانعام سے فائدہ پہنچائیں اور سوال سے پہلے ان کے ضروریات مہیا کریں۔ اے اللہ! مجھے ایسا بنا کہ میں ان میں سے برے کے ساتھ بھلائی کروں اور ان سب کے بارے میں حسن ظن سے کام لوں۔ اور نیکی اور احسان کے ساتھ سب کی خبر گیری کروں۔ اور پرہیز گاری وعفت کی بنا پر ان (کے عیوب) سے آنکھیں بند رکھوں۔ تواضع وفروتنی کی رو سے ان سے نرم رویہ اختیار کروں اور شفقت کی بنا پر مصیبت زدہ کی دل جوئی کروں ان کی غیبت میں بھی ان کی محبت کو دل میں لیے رہوں اور خلوص کی بنا پر ان کے پاس سدا نعمتوں کا رہنا پسند کروں اور جو چیزیں اپنے خاص قریبیوں کے لیے ضروری سمجھوں ان کے لیے بھی ضروری سمجھوں۔ اور جو مراعات اپنے مخصوصین سے کروں وہی مراعات ان سے بھی کروں۔''

(صحیفۂ سجادیہ، ہمسایوں کے بارے میں دعا سے اقتباس)

ISSN2221-1659

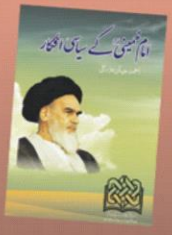

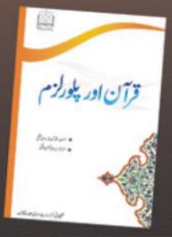

QUARTERLY

RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

جمعہ کی تعطیل نہ ہونے کی وجہ سے ہماری جوان نسل اس دن کی برکات سے مکمل طور پر محروم رہ جاتی ہے، چونکہ وہ اس دن اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں بند ہوتی ہے۔ اب تو ہماری جوان نسل اور بچے جمعہ کے دن کی اہمیت اور تقدس کو بھولتے ہی جارہے ہیں اور ان کی نظر میں اس دن اور ہفتے کے دوسرے دنوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ اس دن کی کوئی مذہبی و دینی حیثیت ہے۔۔۔حتی مذہبی طبقات بھی اپنی مذہبی رسوم تک اتوار کے دن انجام دینے لگے ہیں اور شادی بیاہ کے علاوہ ختم قرآن، میلاد اور مجالس عزا جیسی مذہبی مجالس ومحافل بھی اتوار ہی کو انجام پاتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ کہ دینی تہذیب وثقافت کے علمبردار بعض دینی مدارس اور ادارے بھی جمعہ کے بجائے اتوار کو بند ہوتے ہیں اور فقہ اسلامی میں جمعہ کے واجبات ومستحبات اور اعمال کا درس دینے والے خود غیر اسلامی ثقافت کے مروج بنتے ہوئے جمعہ کو کھلے رہتے ہیں اور اتوار کو بند ہوتے ہیں اور اس طرح ندانستہ طور پر مسلمانوں کی ثقافت کو تباہ کرنے میں کفار ومشرکین کے ممد ومعاون بن جاتے ہیں۔

یہاں کوئی شخص یہ توجیہ پیش کرسکتا ہے کہ دین اسلام میں تعطیل کا کوئی تصور نہیں ہے اور سورہ جمعہ میں بھی نماز جمعہ کے بعد اپنا کاروبار اور تجارت شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن پھر اتوار کے دن یہ دینی مدارس کیوں چھٹی کرتے ہیں اور غیر اسلامی ثقافت کی تقویت کا باعث کیوں بنتے ہیں؟ دوسری جانب حکمران طبقہ اور سیکولر عناصر یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ اتوار کے بجائے جمعہ کے دن تعطیل اقتصادی اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔۔۔معیشت کی ترقی کے بہانے اتوار کی چھٹی کا بہانہ بنانے والوں سے عرض ہے کہ جو مسلمان ممالک مثلاً ایران اور سعودی عرب جمعہ کی تعطیل کرتے ہیں وہ پاکستان سے معیشت میں آگے کیوں ہیں اور پاکستان اتوار کی تعطیل کرنے کے باوجود معیشت میں پس ماندہ کیوں ہے؟

"نمت" (نورالمدیٰ مرکز تحقیقات)

نورالہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

Ph:051-2231937

www.nmt.org.pk|www.nht.org.pk